تخلیق

قیصر تمکین

مرتضیٰ برلاس

عذرا اصغر

ناصر زیدی

ماہ طلعت زاہدی

صالحہ خاتون

فون : ۷۲۳۰۸۰۷

تخلیق

ماہنامہ لاہور

جلد — ۳۰ ● فروری ۱۹۹۹ء ● شمارہ — ۲

مُدیر : اظہر جاوید

قیمت فی پرچہ — ۲۰ بیس روپے

سالانہ — ۱۵۰ ایک سو پچاس روپے

بھگوان سٹریٹ — پرانی انارکلی لاہور ۵۴۰۰۰

ترتیب

اپنی بات ۵

شعر گو اور شاعر — قمر نقوی ۹

قطعات۔ نظمیں۔ گیت۔ ماہیئے

قطعات — قتیل شفائی ۱۳

جوہر کی نمود — جمیل ملک ۱۴

لہو کی فریاد — آفاق صدیقی ۱۵

کشتی کا مسافر — مخمور سعیدی ۱۵

گیت — رفعت سلطان ۱۶

گیت — ناصر شہزاد ۱۷

ہم اب سب منتظر ہیں — محمود شام ۱۸

اعتراف — عین سلام ۱۹

اجیاروں کا راج۔ کالے کوے — لطیف قریشی ۱۹

گیت — صابر آفاقی ۲۰

مری آنکھیں — پنہاں ۲۰

ماہیئے — دیپک قمر ۲۱

ماہیئے — عاصی کاشمیری ۲۱

آئی ایم الیف — ریاض احمد ۲۲

ماہیئے — سیما شکیب ۲۲

مرے رشتے — تقی عابدی ۲۳

پرتھوی و غوری — جاوید زیدی ۲۵

اے بندۂ خدا — شاہدہ لطیف ۲۵

افسانے

سیر گل خوب نہ دیدیم — قیصر تمکین ۲۷

گرہ — عذرا اصغر ۳۳

کھڑکی — محمد سعید شیخ ۴۱

پوسٹ مارٹم — صالحہ خاتون ۴۸

غزلیں

کشمیری لال ذاکر۔ احمد ظفر۔ نسیم سیفی۔ مرتضیٰ برلاس۔ ۵۳
بیدل پانی پتی۔ حسن اختر جلیل۔ اکبر کاظمی۔ ضیا علیگ۔
رشید قیصرانی۔ حسین شاہد۔ کرشن کمار طور۔ عبدالعلی شوکت۔
جگر جالندھری۔ خان پرویز۔ کنول فیروز۔ ابراہیم اشک۔
ناصر زیدی۔ محمد سبطین شاہجہانی۔ عارف ہوشیار پوری۔
سردار پنچھی۔ ایس اے فہیم۔ یاسمین صہبا۔ ماہ طلعت زاہدی۔
نامی انصاری۔ صبیحہ صبا۔ صفدر صدیق رضی۔
سجاد مرزا۔ رعب نواز مائل۔ محمد اسلم۔ انیلہ خان۔ صفیہ راگ۔
خالد جاوید جان۔ ریاض الحق ریاض۔ ملک زادہ جاوید۔
محمد افضل ہزاروی۔ عثمان قیصر۔ محمد جواد حسن۔ سیما سراج۔
روبینہ تحسین۔ مشتاق احمد۔ ۷۶

یادیں

لال سنگھ — ضمیر جعفری ۷۷

سفر نامہ

جس کو دیکھا خمار میں دیکھا — مستنصر حسین تارڑ — ۸۱

جائزے

تخلیق ۹۸ء — انور سدید — ۸۹
ردِ عمل — کیول سُوری — ۱۰۱

پنجاب رنگ

گیت — سلیم کاشر — ۱۱۱
میری کوئی زبان نہیں — افتخار نسیم — ۱۱۲
گیت — اعزاز احمد آذر — ۱۱۳
غزل — امین خیال — ۱۱۴
غزل — محمود رحیم — ۱۱۴
غزل — نظر ملک — ۱۱۵
غزل — سکھوندر امرت — ۱۱۵

تبصرے

۱۱۷ ——— ۱۳۲

انجمنِ خیال

(خطوط) ۱۳۳ ——— ۱۶۰

سرورق

بہ شکریہ
نارنگ ساقی۔ دِلّی

• ناشر ——— اظہر جاوید
• طابع ——— چوہدری فروغ احمد
• مطبع ——— طیبہ پرنٹرز لاہور
• مقامِ اشاعت ——— میکلیگن روڈ لاہور

بسمِ اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اپنی بات

خدا کے فضل سے "تخلیق" کی باقاعدہ اشاعت کا تیسواں (۳۰) سال شروع ہوگیا ہے۔

بہ قول ایک جائزہ نگار ـــــ اگر اس کی بے قاعدہ اشاعت کا حوالہ دیا جائے، یعنی ڈیکلریشن لینے سے پہلے کا ـــــ جب تخلیق مجموعۂ نظم و نثر کے طور پر چھپتا رہا تو اس طرح اس کی زندگی کے پینتیس برس بن جاتے ہیں۔

یہ تین دہائیاں ـــــ دُہائیاں دیتے گزری ہیں۔ ملک کا جغرافیہ بدل گیا، قوم کا مزاج تبدیل ہوگیا اور اہلِ دل، اہلِ نظر اور اہلِ قلم کی وضع داریاں، اصول پسندیاں اور اَنا پرستیاں سب کی سب اُتھل پُتھل ہوگئیں۔

میں تاریخ کا نوحہ نہیں لکھنا چاہتا ـــــ تخلیق کا زائچہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ان تمام برسوں میں "تخلیق" کا احوال بھی پاکستان جیسا رہا ـــــ بحران ـــــ مسلسل بحران ـــــ نظریں ہمیشہ متلاشی رہیں کہ کہاں سے رفاقت کی اعانت ملے اور "تخلیق" کی ریاضت کا سفر جاری رہے۔

مجھے دوستوں سے شکایات کم ہیں اور ان محبّت کرنے والوں کی عنایات کا احساس زیادہ ہے، جنہوں نے میرے حوصلوں کو زندہ اور "تخلیق" کو پائندہ رکھا ـــــ لیکن، ایک دو یا تین چار لوگ کب تک اس مروّت اور روایت کو برقرار رکھیں گے۔

پاکستان میں کل کتنے ادبی پرچے ہیں ـــــ ؟ زیادہ سے زیادہ دس ـــــ اور کسی کی بھی سالانہ قیمت دو سو (۲۰۰) روپے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سہ ماہی رسائل و جرائد کی بات رہنے دیں، مہینے بعد یا دو ماہ کے وقفے سے چھپنے والے رسالے بھی گن لیں ـــــ چار یا پانچ ہوں گے ـــــ ان میں مجموعی طور پر کوئی دو (۲) ہزار اہلِ قلم کی تخلیقات تو شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیا یہ سب چالیس پچاس روپے ماہانہ ادب کے لئے خرچ نہیں کر سکتے ـــــ ؟

میرے تجربے کا جواب ہے ـــ نہیں ـــــ ؟

معاف کیجئے، میں اپنی بات کو بالکل ذاتی بات بنانے لگا ہوں۔

رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ہے، کہ میں نے آج تک کسی لکھنے والے سے نہ تخلیق کی سالانہ قیمت کا مطالبہ کیا ہے نہ کبھی کوئی اور تقاضا ـــــ میں ہنکار نہیں بول رہا ـــــ اللہ کی ذات پر بھروسا رکھ کر چیلنج کر رہا ہوں۔

کوئی ایک ـــــ جی ہاں کوئی ایک ادیب ہی میری بات جھٹلا دے ـــــ

عالم یہ ہے، اگر کچھ لکھنے والے سالانہ قیمت (صرف مبلغ ڈیڑھ صد روپے) کبھی ارسال فرما دیتے ہیں، تو پھر آنے والے برسوں میں اس رسم کو بھول جاتے ہیں۔ شاید یہ خیال فرماتے ہیں کہ انہوں نے عمر بھر کے لئے خریداری کے حقوق لے لئے ہیں ـــــ باہر والے کچھ دوست بھی یہی حُسنِ سلوک روا رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے خوش ظرف ہوتے ہیں، جو دوسرے چوتھے پرچے کے بعد طعنے دینے اور احسان جتانے لگتے ہیں، کہ ہم خریدار ہیں، ہماری تخلیقات ہر شمارے میں کیوں نہیں چھپ رہیں!

رسالہ ڈاک والوں کی نذر ہو جائے تو فوراً نیّت پر شک ہوتا ہے ـــــ انہیں دوبارہ رجسٹری سے (کم و بیش رسالے کی قیمت جتنے ڈاک خرچ سے) رسالہ ارسال کیا جاتا ہے۔

ایسے الزامات کے بعد کتنے تھُڑدلوں کی سالانہ قیمت واپس کر چکا ہوں، یہ فہرست بھی لمبی ہے۔

میں نے اعتراف کیا ہے، "تخلیق" کو تیس سال کی عمر دینے میں میرا کوئی کمال نہیں ـــــ یہ خداوندِ ذوالجلال کا خاص کرم ہے۔ ورنہ، اِس راہِ پُرخار میں تھک تھک کے نہ جانے کتنے رہرو دم توڑ گئے۔

"ادب دوست" کے دسمبر کے شمارے میں اعلان ہے، یا احتجاج ہے کہ اکادمی ادبیات نے چونکہ صرف چند ادبی رسائل کو نوازا ہے، لہٰذا ہم رسالہ بند کر رہے ہیں۔

یہ طمانچہ اکادمی ادبیات کو نہیں، ہماری بدنصیبی کے منہ پر پڑا ہے۔

"فنون" ـــ "ادبِ لطیف"، "افکار"، "علامت" اور ـــ "تخلیق"، ان سب کو یا ان میں سے کسی ایک کو بھی ان کی زندگیوں میں کبھی کوئی ایک بھی سرکاری پھُندنا نہیں لگا ـــــ سرپرستی کے عنوان سے کسی مالی معاونت کی جھالر نہیں ٹنگی۔

اکادمی کے نوازنے کی کہانی بھی ملاحظہ فرمالیں۔

ممتاز اور مقبول ادیب شفیق الرحمٰن جب اکادمی ادبیات کے چیئرمین تھے، تو انہوں نے ادبی رسائل کے مسائل کو سمجھتے ہوئے یہ کوشش کی تھی کہ اخبارات کی طرح ادبی رسائل کو بھی سرکاری اشتہارات ازخود ملنے لگیں۔

یہ سعی بارآور نہ ہو سکی۔

اُن کے بعد جو بھی چیئرمین صاحب آئے، اپنے مفادات کی نگہداشت میں لگے رہے۔

پچھلے برس تک، جو صاحب، اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر جنرل تھے، وہ ادیب تھے۔ اُن کے دل میں ادبی رسائل کی محبّت جاگی۔ انہیں یہ یقین آ گیا کہ اتنے برسوں کے تواتر میں سرکاری دفاتر نے کچھ نہیں کرنا ـــــ یہ خدمت یا کام بھی اکادمی ادبیات کی کارگزاری میں ہے ـــــ

انہوں نے ایک تجویز بنائی، جس پر سابق چیئرمین نے صاد کیا ـــــ مگر حکومت اُلٹنے کے ساتھ اُن کی کُرسی بھی پلٹ گئی۔ نئے چیئرمین نے بھی اس تجویز کو پسند اور قبول کیا۔

لاہور میں مدیرانِ ادبی جرائد کے ساتھ ایک ملاقات میں چیئرمین اکادمی ادبیات اور ڈائریکٹر جنرل نے ایک لائحہ عمل مرتب کیا اور اس کی تکمیل کا حتمی وعدہ (اور دعویٰ) کیا ـــــ چیئرمین صاحب نے حکومتی دفتری نظام کو ہلانے اور صاحبانِ اختیار کو منانے کی بھرطور کوشش کی، اور اپنے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں اس کی کامیابی کا اعلان بھی کیا ـــــ

دن گزرتے گئے ـــــ مہینے لپکتے ہوئے ایک سال میں بدل گئے، لیکن روایتی نوکر شاہی نے بہت "بااختیار" چیئرمین اکادمی ادبیات کو بھی بے بس کر دیا ـــــ

اپنے عہد کا پاس کرنے اور متعلقہ سرکاری محکموں سے آس رکھے رکھنے کے سلسلے میں چیئرمین اکادمی ادبیات نے بیس سال سے زیادہ عرصے سے چھپتے رہنے والے چند جرائد کو اکادمی کے اشتہارات جاری کئے۔ یہ ایک رسمی کارروائی ہے جس میں نوازش، کرم یا داد و دہش کا کوئی رُخ نمایاں نہیں۔

پانچ ماہ ہو گئے ہیں، یاددہانی کے باوجود ان کی ادائیگی نہیں ہوئی۔

تیس سال پہلے اکادمی ادبیات کا کہیں وجود ہی نہیں تھا ـــــ آج کے چیئرمین اور گئی کل کے چیئرمین سمیت، اِن کے اور اُن کے محبوب حکمران بھی اس مقام پر پہنچنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

کل یہ بھی نہیں ہوں گے، لیکن یہ یاد رکھیں، "نیرنگِ خیال"، "ادبِ لطیف"، اور "افکار" جیسے رسائل ساٹھ سال سے شائع ہو رہے ہیں، اور انشا اللہ ہوتے رہیں گے۔

اللہ نے چاہا تو "تخلیق" کی لَو بھی اونچی رہے گی۔

اشتہاروں کی رقم نہ دینے والے اور خریداری کی قیمت بھیج کر سودا کرنے والے اپنا جتن کرتے رہیں ـــــ رب العزت اپنی رحمتیں اور برکتیں نچھاور کرتا رہے گا۔ کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی مقام سے ایسا دردمند اُٹھ ہی پڑتا ہے جو چاہتا ہے "تخلیق" "ختم نہ ہو ـــــ "ادب دوست" قائم رہے اور ادب کی مہکار اور چہکار دائم رہے۔

میں نڈھال ہونے لگتا ہوں تو کچھ ایسے ہیں جو ڈھال بن جاتے ہیں۔ یوں، بفضلِ تعالیٰ "تخلیق" کا سلسلہ جاری رہے گا، ساری رہے گا۔

اظہر جاوید

شعر گو اور شاعر

قمر نقوی (امریکا)

اردو ادب میں نظم کو نثر پر فوقیت حاصل رہی اور غالباً یہ بات دوسری ساری قدیم زبانوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہ قدیم ترین تخلیقات جو مختلف اقوام کے ادب میں پائی گئیں، بیشتر منظوم ہیں۔ ہر دور میں نہ صرف یہ کہ شعراء کی تعداد ادیبوں کی نسبت زیادہ رہی بلکہ شعراء کو زیادہ اہمیت اور شہرت بھی ملی۔ اس کا بڑا سبب وہ شرف قبول ہے جو شعر کو بالعموم حاصل ہوتا ہے اور جس کے ذریعے شاعر اپنے ماضی الضمیر کو لطیف، فصیح، بلیغ اور حسین الفاظ کے ذریعے سامع تک ارسال کرتا ہے۔

شعر گوئی کی صلاحیت فطری ہوتی ہے۔ یہ ضرور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں شعر تخلیق کرنے کی صلاحیت قدرت کاملہ کی عطا سے حاصل ہوتی ہے ان کے دماغ میں دو چار ریشے یا Chips اضافی ضرور ہوتے ہوں گے۔ یہی اضافی Chips اس شخص کو وہ الفاظ، مطالب اور مفاہیم تخلیق کرنے کی اہلیت عطا کرتے ہوں گے جو حسین عبارت یا متاثر کرنے والے اشعار کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔

شعر گوئی کی صلاحیت ہر شخص کے حصے میں نہیں آتی۔ قدرت اس استعداد کی تقسیم میں بخل سے کام لیتی ہے۔ ہر معاشرے میں لاکھوں نفوس کی آبادی میں چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو خداوند کریم یہ وصف عطا فرماتا ہے۔

کچھ ایسے افراد جن میں شعر تخلیق کرنے کی صلاحیت قدرتی نہیں ہوتی ہے بعض خارجی محرکات کے تحت شاعری کرنے لگتے ہیں۔ ان کو اس صنف کی طرف راغب کرنے میں قوی ترین کردار ان توصیفی نعروں کا ہوتا ہے جو مشاعروں میں شعراء کا کلام سن کر سامعین بلند کرتے ہیں۔ ان نعروں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور سے لوگ شعر و سخن کو کس قدر پسند کرتے ہیں۔

کامیاب شعراء کو بہت جلد ہر دلعزیزی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی شرف بعض غیر شاعر تک بندوں کو شاعری کی طرف رجوع کر دیتا ہے۔

شاعری اکتسابی فن نہیں ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ وہ شخص جس میں یہ استعداد فطرتاً نہ ہو وہ محض مطالعے اور مشق سے کامیاب شاعر بن سکے۔ ایسا شخص اگر کچھ شعر تخلیق بھی کرنے لگے تب بھی اس کا کلام اس کی نااہلی کا غماز

ہوتا ہے۔ جو لوگ اس صلاحیت سے محرومی کے باوجود شاعری کرنے لگتے ہیں اول تو وہ باوزن اور اعلیٰ معیاری اشعار تخلیق نہیں کر سکتے ان کے کلام میں کسی نہ کسی موقعے پر عروض کی کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جو اہل نظر سے چھپی نہیں رہتی۔ لطف یہ کہ ان غلط کاروں کو خود اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کی طبیعت میں قدرتا موزونیت کا وجود نہیں ہوتا۔

ممکن ہے بعض غیرفطری سخن گو کسی واقعی شاعر کی شاگردی اختیار کر کے اپنے بے وزن اور بے ترتیب کلام کی تصحیح کرا لیں اور کلام باوزن اور مناسب شکل اختیار کر لے لیکن ان کے خیالات میں رفعت و ندرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بندش اور ترکیب کی خوبیاں نہیں ہوتیں۔ خیالات میں عمق نہیں ہوتا۔ جمال لفظی اور کمال معنی نہیں ہوتا۔ ایک فطری شاعر کا شعر درج ذیل ہے:

سر جھکائے ہوئے چپ بیٹھا ہوں
بات کرنے کا ہنر یاد نہیں

اس کے مقابل--- ایک خود ساختہ شاعر کا شعر ہے:

ارے شام کو مرے دوستو نہ عذاب بن کے ملا کرو
مجھے میکدے میں ملو اگر تو شراب بن کے ملا کرو

دونوں اشعار کا سرسری مطالعہ بھی فرق ظاہر کر دیتا ہے۔

اسی طرح ایک مشاعرے میں ایک نوعمر شاعرہ اپنا کلام بہت مسحور کن ترنم سے سنا کر بے انتہا داد و تحسین حاصل کر رہی تھیں۔ کلام کی پختگی' الفاظ کی بندش اور حسن معانی سب ہی کچھ یہ ظاہر کرتے تھے کہ شاعرہ فن شعر سے آگاہ ہے۔ لیکن یکبارگی اسی دوران ایک مصرع پڑھتے وقت ان سے یہ سہو ہوا کہ جہاں لفظ کو اضافت کے ساتھ پڑھنا چاہیے تھا وہ انہوں نے نہیں پڑھا-- بعض بزرگ شعراء نے مصرع دہرایا اور اس کو صحیح پڑھا تاکہ شاعرہ اپنی غلطی کا احساس کر کے درست پڑھیں--- لیکن بات ان شاعرہ کی سمجھ میں نہیں آئی--- اہل فن ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ اور یہ بات مسلم ہو گئی کہ جو کلام وہ پڑھ رہی ہیں وہ ان کا اپنا کلام نہیں ہے۔

شاعر کی طبیعت میں موزونیت کا فقدان ان کی کوتاہیوں کا رازطشت ازبام کر دیتا ہے۔ کسی موقعے پر غزل پڑھتے وقت ان سے ایسی فاش غلطی سرزد ہو جاتی ہے جو ان کی نااہلی ثابت کر دیتی ہے۔ جو لوگ فن کو سمجھتے ہیں ان کو فوراً" معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سخن گو واقعی شاعر نہیں ہے۔

یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو میں شعر کہنے کے لئے زبان اور الفاظ پر قدرت ہونا ضروری ہے۔ اگر الفاظ کے صحیح استعمال کا علم نہ ہو تو کلام غلط اور مبتذل ہو جاتا ہے۔ ذخیرہ الفاظ کی کمی ہو تو مطلب واضح طور سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی مفہوم کی ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب اس مفہوم کو مناسب ترین الفاظ کے وسیلے سے ادا کیا گیا ہو۔ الفاظ کی ناموزونیت شاعر کو جاہل ثابت کرنے میں معاونت کرتی ہے۔

اردو کا اہل زبان ہونا مفید بھی ہے اور کارآمد بھی۔ وہ شخص جو کاملاً" اردو کے ماحول میں پیدا ہوا' جس نے

آنکھ کھولتے ہی صرف اردو الفاظ ہی سنے' جس نے اردو کے ماحول میں پرورش پائی' اس کی اردو قابلیت مسلمہ ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس نے اس زبان کا علم بھی حاصل کیا ہو۔ اردو کا وہ اہل زبان جس نے کوئی علم حاصل نہ کیا ہو' جاہل رہ گیا ہو' اس کو اہل زبان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ وہ روانی کے ساتھ روزمرہ اردو میں گفتگو کر سکے۔ ایسا شخص فصیح اردو بھی نہیں بول سکتا۔ اس کا اہل زبان ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

بعض متقدمین شعرا جن کو اردو شاعری کے ابتدائی دور میں رتبہ استادی بھی ملا۔ قطعاً جاہل تھے۔ یعنی اس دور کے علوم مروجہ سے بھی بے بہرہ تھے۔ اگرچہ اہل زبان تھے اور فطری شاعر۔ لیکن محض بے علمی کی وجہ سے ان کے کلام میں لفظ و بیان کے نقائص موجود ہیں جو صاحبان علم بہ آسانی شناخت کر لیتے ہیں۔ بعض شعرا کا کلام محض ان کی جہالت کی وجہ سے درجہ معیار سے ساقط ہے۔ گو ان کو قبول عام ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

علم کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ ہے۔ جہالت کی کمتری اور ذات کا اپنا مقام ہے۔ ان دونوں کا فرق سب کو معلوم ہے۔ علمی درسگاہیں ہر زمانے میں ہر معاشرے میں موجود رہی ہیں۔ لوگ علم حاصل کرتے رہے ہیں۔ جن قدیم شعراء نے علم حاصل نہیں کیا وہ تعلیمی درسگاہوں کی عدم موجودگی کے باعث نہیں تھی۔ وہ لوگ اس لئے جاہل رہ گئے کہ انہوں نے علم حاصل ہی نہیں کیا۔ ان کو اس کی رغبت ہی نہیں تھی۔ صرف شاعری سے دلچسپی تھی۔

اس زمانہ قدیم میں جبکہ اردو ادب ابتدائی دور میں تھا شاعر ہونا ایک امتیاز تھا۔ اس لئے ان کو شہرت ملی۔ اور شعراء کی قلیل تعداد کے پیش نظر ان میں سے بعض کو مرتبہ استادی بھی مل گیا---!

کسی بھی فن میں شہرت' عزت اور عظمت حاصل کرنے کے لئے علم کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ عصرحاضر میں بے علمی--- یا--- جہالت--- کا کوئی مقام نہیں۔ یوں بھی عام روایت رہی ہے کہ شاعری مفلوک الحالی اور آخرش تباہی کا موجب بنتی ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں اس نوعیت کی بعض مثالیں ملنا مشکل نہیں۔

البتہ--- کمال فن--- صرف موزونیت طبع اور علم و دانش کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ کامیاب شاعری کے لئے فن شاعری جاننا ازبس لازمی ہے۔ شاعری کی بھی کچھ فنی ضروریات ہوتی ہیں۔ ان سے آگہی حاصل کرنا ضروری ہے اور اس فن سے متعلق جو علم ہے اس کا نام ہے "عروض"۔ یہ وہ پیمانہ ہے جو اشعار کے اوزان' بحور' ردیف و قوافی' قواعد و ضوابط' حسن و قبح' کی تنظیم و ترتیب بیان کرتا ہے۔ جو کلام "عروض" کے قواعد کی پابندی نہ کرتا ہو وہ فن کے لحاظ سے قابل اعتنا نہیں ہوتا۔

شاعری ایک لطیف صنف ادب ہے جو انسان کے نہایت نازک دلکش اور دلچسپ جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ ان احساسات کا تذکرہ کرتی ہے۔ جن کا بیان صرف شاعر کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ شاعر یا ادیب میں مشاہدے کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا شعور ہر واقعے یا صورت حال کا اپنے منفرد انداز اور زاویہ نگاہ سے تجزیہ کر کے ایک خاص نتیجے پر پہنچتا ہے۔ اور شاعر ان نتائج کو بہت حسین' فصیح اور بلیغ انداز میں شعر کا قالب عطا کر دیتا ہے۔ جس طرح مصور اپنے نقوش میں مختلف رنگوں کی آمیزش سے اپنے جذبات اور مشاہدات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے اور ناظرین کی حس لطیف کو متاثر کرتا ہے اس طرح شاعر بھی الفاظ کی مرصع کاری' شائستگی اور مناسبت کے ذریعے

اپنے خیالات کی لطافت اور جمال کو سامعین اور قارئین تک پہنچاتا ہے۔

شعر کی لطافت' جمال' شوخی بیاں' سحرالفاظ' فصاحت' اخلاق و شائستگی کی بھی متقاضی ہے۔ خصوصاً اس حال میں کہ شاعری کو الہام ربانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ اشعار میں جذبات کا اظہار' شرافت' اخلاق کی اقدار کو قائم رکھے۔ شیطان کی اتباع کے امکانات تو بہت ہوتے ہیں۔ کیونکہ شیطان ہر وقت انسان--- بہکانے کے لئے رہتا ہے۔ وہ لوگ جو اشعار میں ____ کم از کم تہذیب و متانت کے منافی مضامین یا الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو شیاطین نے اپنے راستے پر لگا لیا ہے۔ جو راہ راست سے ہٹ گئے ہیں۔

"اُردو افسانے میں رومانی رجحانات"

ڈاکٹر محمد عالم خان

آراء : احمد ندیم قاسمی ۔ ڈاکٹر وحید قریشی

دیباچہ : ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مکتبہ علم و عرفان ۔ لوئر مال لاہور

افسانوں کے مجموعے "بدن کا طواف" آدم جی ادبی انعام یافتہ

افسانوں کے مجموعے "خشکی پر جزیرے"

اور

ناول "معتوب"

کے مصنف، نگارِ پاکستان کے مدیر اور کئی ادبی کتب کے

مرتب

اُمراؤ طارق

کے بیس تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ

"تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے"

شائع ہو گیا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصے سے

شاعری کا اعتبار اور وقار

قتیل شفائی کا

تازہ مجموعہ

مونالزا

____ عشق کو معتبر کرنے والی شاعری

____ حدوں اور سرحدوں سے گزر کر دلوں میں گھر کرنے والی شاعری

قطعات

پُرانے مُسترد لوگوں کی ٹولی
بڑی حسرت سے آہیں بھر رہی ہے
مگر میری نظر سرشار ہو کر
تری آنکھوں کو سجدے کر رہی ہے

پڑے گا فرق کیا اس سے عدو کو
اگر تم اُس کو جاں سے مار بھی دو
نہ شرم آئے گی اُس کو اور نہ غصّہ
بھکاری کو اگر دھتکار بھی دو

بہت تدبیر کی پر کیا کروں میں
مری تقدیر ضد پر اَڑ گئی ہے
ذرا سا مُسکرا دو تم — کہ مجھ کو
گلابوں کی ضرورت پڑ گئی ہے

بہت اچھی طرح میں جانتا ہوں
مزے تم دردِ دل کے چکھ رہی ہو
مگر اس کا جو اصلی ذائقہ ہے
کہیں اس کو چھُپا کر رکھ رہی ہو

جو میری ملکیت ہو — صرف میری
مَیں ایسی چیز کا جویا بہت ہوں
مزے خوابوں کے لینا چاہتا تھا
گزشتہ رات میں سویا بہت ہوں

چلیں گے عمر بھر ساغر پہ ساغر
یہ دَور آخر تلک جاری رہے گا
مِرے اعصاب پر اور تیرے دل پر
محبّت کا نشہ طاری رہے گا

میں پہنچوں گا ضرور اِس بار تم تک
نہ پہنچا تو (تمہیں سمجھا رہا ہوں)
سمجھ لینا کہ سانسوں کے کنارے
تمہارا منتظر بیٹھا ہوا ہوں

جمیل ملک

جوہر کی نمود

اک رقصاں جوہر ہے دل کا
اک رخشاں جوہر ذہن کا ہے
دونوں ہیں ایک ہی رشتے کے
دائم اور قائم پیمانے
دونوں کی رگ جاں سے ہے نمو
یہ جسم چمن ہے دونوں کا
لیکن اپنی اپنی خوشبو
اک جوہر باہر کو لپکے
ذرے میں شورِ قیامت ہو
اک جوہر جب اندر چمکے
دونوں کو کیسی راحت ہو!
جب ذہن میں، دل میں دُوری ہو
تو پھر انجام تباہی ہو

ہو اِن میں مکمّل یارانہ
تو آپ ہی امن، سپاہی ہو
دنیا کے گلشن گلشن میں
ہر رنگ کے کیا کیا پھول کھِلیں
جو بچھڑے ہوئے صدیوں سے
سب اک منزل پر آن ملیں
جو زخم ہیں سارے پھول بنیں
اونچا سر — خم ہو راجہ کا
دھرتی پر راج ہو پرجا کا

آفاق صدیقی

لہو کی فریاد

سنو اے ساکنانِ شہرِ ناپُرساں
اُداسی پوچھتی ہے
زخم خوردہ وقت کا ہر لمحۂ موجود
کس کو یاد کرتا ہے
ستم گر کون ہے ؟
کیوں نت نئے تازہ ستم ایجاد کرتا ہے
یہ کس کا دستِ نادیدہ
ہماری بستیوں کو کشتۂ بیداد کرتا ہے
کسے قاتل کہیں
جو اتنی بے دردی سے
جیتے جاگتے جسموں کو خاک و خوں بنا کر
کتنے گھر برباد کرتا ہے
لہو فریاد کرتا ہے

مخمور سعیدی
(بھارت)

کشتی کا مسافر

تیز ہواؤں کا موسم ہے
دل دریا میں طغیانی ہے
ساحل تک پانی پانی ہے
ساحل سے ٹکراتی موجیں
تیز ہواؤں کی ساتھی ہیں
تیز ہوائیں جن کی زد پر
میرے احساسات کی کشتی
ہچکولے کھاتی رہتی ہے
سوچ رہا ہوں
کشتی سے پانی میں اُتر لوں
دریا کی گہرائی کا اندازہ کر لوں

رفعت سلطان

گیت

پاگل منوا نیر بہائے
جانے کس کی یاد ستائے

پاگل منوا نیر بہائے

یاد آئیں جب گزری باتیں
گزری باتیں، بھیگی راتیں

بیٹھے بیٹھے جی بھر آئے
پاگل منوا نیر بہائے

جگ میں پریت کی ریت نہیں ہے
کوئی کسی کا میت نہیں ہے

رفعت کون اسے سمجھائے
پاگل منوا نیر بہائے

ناصر شہزاد

گیت

تُو آنکھوں سے دُور
دل ہے بہت مجبُور

جنگل، گھور گھٹا
سنکے سرد ہوا
پٹڑی پر گاڑی
تن کی طلب گاڑھی
سانس کی رَو رنجور
تُو آنکھوں....

تُو ہے نہ تیری چاپ
کھوئے سبھی ملاپ
ڈیوڑھی، نلکا، ہاتھ
سُونے دن اور رات
دل بے کل بے نُور
تُو آنکھوں.....

جُھمکے، جھومر، ہار
تجھ بن سب بیکار
آلوچوں کے باغ
کھڈیں، کھنڈر، کھڑاگ
ہجرت عین حضور
تُو آنکھوں.....

نہر.... نواح میں کار
تنہا سفر.. دشوار
گھاٹ کے نیچے ناؤ
پڑ گئے روح میں گھاؤ
تجھ بن من مہجور
تُو آنکھوں....

محمود شام

ہم اب سب منتظر ہیں

ہم اب سب منتظر ہیں
پوری شدت سے
مگر کس کے — ؟
خبر کس کو — ؟
مگر سب منتظر ہیں۔

سمندر ! ہم تمہارے منتظر ہیں
ہمارے ظرف گہرائی سے عاری ہو چکے ہیں
تمہیں زحمت تو ہوگی — آ کے سمجھاؤ
کہ گہرائی میں پانی کیسے بہتا ہے ؟
سکوں چہرے پہ دائم کیسے رہتا ہے ؟
وہ جب آتی ہیں پورے چاند کی راتیں
تو کیسے جوش آتا ہے
کناروں سے۔
زمانے سے
بغاوت کیسے ہوتی ہے

ستارو ! ہم تمہارے منتظر ہیں
کسی دن تم ڈرائنگ روم میں اترو
کہ سڑکوں پہ تو اب ہم آ نہیں سکتے
بتاؤ — اب ہمارا کیا مقدر ہے
ہمارے رہنما کیوں رہبری کے فن سے عاری ہیں
تمہیں زحمت تو ہوگی ان کو سمجھاؤ

اندھیرے میں کسی کو راستہ کیسے دکھاتے ہیں ؟
شبوں میں پھیلتی آلودگی سے کس طرح دامن بچاتے ہیں ؟

پرندو ! ہم تمہارے منتظر ہیں
کہ ہم تو طاقتِ پرواز اب رکھتے نہیں ہیں
ہم اک دوسرے کے پر تو خود ہی کاٹ دیتے ہیں
تمہیں زحمت تو ہوگی، آ کے سمجھاؤ
پروں کو قینچیوں سے کس طرح محفوظ رکھتے ہیں
شکاری کی نگاہیں کس طرح سے بھانپ لیتے ہیں
جہاں ہو دام ہم رنگِ زمیں تو کس طرح اڑنا ہے
آزادی بچانی ہے۔
کسی برسات سے پہلے
کسی طوفان سے پہلے
پہنچ جاتے ہیں کیسے آشیانوں گھونسلوں میں۔
اور انہیں موسم کی شدت سے بچاتے کس طرح ہیں
کس طرح مضبوط رکھتے ہیں

سمندر کب کسی کے گھر میں آتا ہے
ستارے کب ڈرائنگ روم میں اترے
پرندوں نے کہاں اسکول کھولے ہیں

مگر ہم تو کسی کے منتظر ہیں۔
نہ جانے کون آئے گا
نہ جانے کب وہ آئے گا

عین سلام

اعتراف

یہ جاننا چاہیئے
ہم آپس میں
حُسن اور خیر بانٹتے ہیں

ہم آپ کی صحبتوں میں
خوش خُلق اور شائستہ ہو گئے ہیں
بعنیہٖ
آپ بھی زیادہ حسین لگنے لگی ہیں

یہ دلکشی ، یہ اعجازِ حُسن ، یہ شانِ دلبرائی
ہماری صحبت کا اک کرشمہ ہے
جان لیجے

یہ جان لیجے
کہ ہم سبھی نیک لوگ
آپس میں حُسن اور خیر بانٹتے ہیں

لطیف قریشی

اجیاروں کا راج

اندھیاروں کا راج تھا ہر سُو
کپل وستو کے راج محل سے
بھکشو بن کر آیا سدارتھ
دان گیان نروان کیا :
اجیاروں کا راج کیا :

اندھیاروں کا راج ہے آج
بھکشو بن کر آئے کوئی
دان گیان نروان کرے
اجیاروں کا راج کرے

کالے کوے

کچے گھر کے صحن میں بیٹھا
بچہ روٹی کھاتا ہے
کانٹے دار درخت سے اڑ کر
کوے اُترے
بچے سے وہ روٹی بھی
چھین کے لے گئے کالے کوے

صابر آفاقی

گیت

من میں دیپ جلاؤ ساجن
ڈوب گئے ہیں سُندر تارے
ہر سُو چھائے ہیں اندھیارے
آؤ۔ لَوٹ کے آؤ ساجن
من میں دیپ جلاؤ ساجن

سرسوں پھولی سبزے لہکے
پنچھی چہکے، بن بن مہکے
پھول بنو کھل جاؤ ساجن
من میں دیپ جلاؤ ساجن

جیون تاگا ٹوٹ چلا ہے!
پریت کا دامن چھوٹ چلا ہے
جیون رس برساؤ ساجن
من میں دیپ جلاؤ ساجن

پنہاں
(امریکا)

مری آنکھیں

مری آنکھیں جو دیکھیں
سہ نہ پائیں
اور ہمیشہ آنسوؤں میں ڈوب جائیں
مگر میری یہی آنکھیں
مری تصویر میں جو ہیں
سبھی کچھ دیکھتی ہیں
پر کبھی روتی نہیں ہیں یہ
ہمیشہ مسکراتی ہیں
مرا جی چاہتا یہ ہے
کوئی لمحہ مجھے تصویر کر جائے
مری آنکھیں ہر اک منظر کو سہنا سیکھ جائیں
اور ہمیشہ مُسکرائیں

دیپک قمر
(بھارت)

ماہیئے

سوچوں میں پڑا دل ہے
ہے عمر بڑھاپے کی
آسان بھی مشکل ہے

اپنا یا پرایا کیا
اِن خوابوں کے پتلوں سے
رشتہ ہے بنایا کیا

گُم نام ہے بچ جاتا
ہر کام کو کر کے بھی
الزام نہیں آتا

سمجھوتہ کرو خود سے
اِس دل کو بھی سمجھاؤ
اتنا نہ ڈرو خود سے

کہنے سے نہ کتراؤ
ایسا نہ ہو چُپ رہ کر
پھر بعد میں پچھتاؤ

ایسا ہے نہ ویسا ہے
جو نہلے پہ دہلا ہو
یہ جیسے کو تیسا ہے

اس عشق کا کیا حاصل
اب مستی خیالوں کی
محسوس نہ کرتا دل

نوچے ہی چلا جائے
یہ کوئی درندہ ہے
موہوم سا ڈر کھائے

عاصی کاشمیری
(انگلستان)

ماہیئے

دونوں کا ہے غم سانجھا
ہیر ہو یا شیریں
فرہاد ہو یا رانجھا

پھولوں سے بھرے دامن
تم کو مبارک ہو
یہ سالگرہ کا دن

اِک اِک سے حسیں چھوری
شہر ہے نوٹنگم
انگلینڈ کا دل گوری

مقصد سے عداوت کی
قوم کو لوٹا ہے
جس نے بھی سیاست کی

اب دیکھ لو جی بھر کے
پھر نہیں آؤں گا
اڑ جاؤں گا پُھر کر کے

ریاض احمد

آئی لیم ایف

اُس نے کہا "کیا کھاؤ گے؟"
جانے مجھے اس بات پہ کیوں
ایک حکایت یاد آئی ....
اک سادہ لوح تھا جس نے شرط بدی تھی
اور شرط نبھاتے
سو جُوتے کھائے، پیاز بھی کھائے
اس سوچ میں گُم بے دھیانی میں
میں نے کہا: اے جانِ جہاں
تیرا جُوتا نازک بھی ہے، قیمتی بھی ہے
ڈرتا ہوں کہیں یہ ٹوٹ نہ جائے
پیاز بھی کون سا سستا ہے جو کھائے کوئی
سچ تو یہ ہے
میرے لئے یہ فکر / یہ تشویش عبث ہے
جینا میرا لازم ٹھہرا تو اے جانِ جہاں
میں گھاس بھی کھا کر جی لوں گا
یہ بھی نہ ہو تو غم (جو بہت ہے)
کھا کے جی لوں گا۔ اے جانِ جہاں!

لیکن اب میں سوچ رہا ہوں
اُس نے کیوں پوچھا تھا۔
اب کیا کھاؤ گے؟

سیما شکیب

ماہیئے

سینے میں چُبھا کانٹا
درد جدائی کا
سکھیوں نے نہیں بانٹا

بچے کی کلکاری
مہکا دیتی ہے
جیون کی پھلواری

مہندی کا رچاؤ ہے
کس کو خبر دل میں
کتنا بڑا گھاؤ ہے

ہائے سُوکھ گیا بوٹا
بول سکھی کس نے
گہنا تیرا لُوٹا

گوری نے جلائی آگ
پھیل گئی خوشبو
لسّی، سرسوں کا ساگ

اب کتنے اکیلے ہیں
نیم تلے برسوں
ہم دونوں کھیلے ہیں

تقی عابدی
(امریکا)

مرے رشتے مجھے واپس دے دو

رشتہ کیا چیز ہے ؟
رشتے کی حقیقت کیا ہے ؟
رشتے کی آج کی دنیا میں ضرورت کیا ہے ؟
رشتہ گر جنس ہے
اس جنس کی قیمت کیا ہے ؟
رشتہ ہے خون
تو اس خون کی رنگت کیا ہے ؟
رشتہ ہے جذبہ
تو اس جذبہ میں لذّت کیا ہے ؟
رشتہ ہے عشق
تو پھر اس میں عداوت کیا ہے ؟
رشتہ احساس ہے
محسوس مجھے کرنے دو
رشتہ آتش ہے
تو اِس آگ کے شعلوں میں مجھے جلنے دو

رشتہ ہے جال اگر مکڑی کا
تو مجھے جال کے تاروں میں پھنسا رہنے دو
رشتہ رستہ ہے اگر کانٹوں کا
تو اسی راستے پہ چلنے دو
رشتہ چاہے تو ذولیخا کو جوانی دے دے
رشتہ پیاسے کو بیابان میں پانی دے دے
رشتہ الفاظ کے ہونٹوں کو کہانی دے دے
بے نشاں قبروں کو چاہے تو نشانی دے دے
رشتے رنگین ہیں اور رنگ ہیں اس کے گہرے
رشتے سایوں کی طرح جسم سے چمٹے دیکھے
دنیا والوں کو انہی رشتوں میں سمٹے دیکھے
رشتہ ہر شخص کے چہرے سے نظر آتا ہے
رشتہ رہ جاتا ہے انسان چلا جاتا ہے
رشتہ دیوار میں سایہ کی طرح رہتا ہے
اور کبھی آنکھ سے آنسو کی طرح بہتا ہے

رشتہ ماں باپ سے ہے خون کی گہرائی کا
جس طرح پانی سے رشتہ ہو کسی ماہی کا
رشتہ اولاد سے ہے شکل و شناسائی کا
جس طرح آنکھ سے رشتہ ہوا بینائی کا
رشتہ ہے درد و محبّت سے بہن بھائی کا
رشتہ ہے دوست سے دلجوئی دل آرائی کا
جس طرح ریگ سے بستر بنا صحرائی کا
رشتہ معشوق سے ہے عشق کی گیرائی کا
جس طرح سانس سے رشتہ رہا شہنائی کا
رشتہ ہے جسم سے انسان کی زیبائی کا
جیسے یوسف سے رہ و رسم زولیخائی کا
توڑ کر سارے یہ رشتے میں چلا آیا ہوں

مرے معبود!
ترے رشتے کو رنگیں کرنے
رنگ کچھ عشق و محبّت کے سنہرے بھرنے
تاکہ دل میں کوئی گوشہ نہ رہے
تری چاہت کے سوا
مری راحت ہے یہی میری ضرورت ہے یہی
مری قربت ہے یہی میری رفاقت ہے یہی
مرے خاموش خیالوں کی صداقت ہے یہی
مرے الفاظ میں پوشیدہ لطافت ہے یہی

مرے ہم سخنو
ہم وطنو
ہم چمنو
مرے دل بندو نظر کے دھارو
مرے دل کے تارو
مجھ پہ احسان کرو، مجھ پہ احسان کرو
مرے رشتے مجھے واپس دے دو
مرے رشتے مجھے واپس دے دو

٭ ٭ ٭

جاوید زیدی
(امریکا)

پرتھوی و غوری

میری نفرتوں کے یہ فیصلے
میری غربتوں کا جواز ہیں
میرے محسنوں کو خبر کرو
مرا مرضِ جاں تو کچھ اور ہے !!

انہیں پرتھوی کی نوید ہو
چلو جشنِ غوری منائیں ہم
بھری کھیتیوں کو جلائیں ہم
نئی دوزخوں کو بنائیں ہم
مرے دُکھ کی گو یہ دوا نہیں
مرا مرضِ جاں تو کچھ اور ہے

جو ہیں زندگی کے عتاب میں
جو ہیں وحشتوں کے عذاب میں
انہیں کشتِ رزم سے ملے گا کیا
یہ تو مسئلہ ہی کچھ اور ہے :

وہ سویر بھی تو نہیں ہوئی
ابھی دیر بھی تو نہیں ہوئی
پسِ آئینہ ہیں جو نفرتیں
انہیں عکسِ جاں سے نکال دو
یہی تیرگی کا علاج ہے
یہی مرضِ جاں کا علاج ہے
یہی تیرے دُکھ کی دوا بھی ہے
یہی میرے غم کا علاج ہے :

(ریڈیو سے "غوری" میزائل کی خبر سننے کے بعد)

شاہدہ لطیف

اے بندۂ خدا

تم اکثر شکوہ کرتے ہو
تم اکثر روتے رہتے ہو
حق میرا اِس سے زیادہ تھا
مجھے یہ نہ ملا مجھے وہ نہ ملا
اے بندۂ خدا کچھ سوچ ذرا
جو تم سے کم تر رکھتے ہیں
کیا تم نے بھی کچھ اُن کو دیا

سیر گل خوب نہ دیدیم

قیصر تمکین (انگلستان)

دوپہر کے وقت قرق امین آیا۔ اس نے زبردستی گھر میں داخل ہو کر سامان کی فہرست تیار کرنا شروع کی۔ چولہا' کپڑے دھونے کی مشین' ٹیلی ویژن' ریفریجریٹر وغیرہ۔ وہ سب چیزوں کے نام لکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ جو دو کارندے تھے وہ سامان کی قیمت کا اندازہ کر رہے تھے۔ مثلاً" یہ کہ کھانے کی میز اور کرسیوں کی قیمت اس نے بیس اور تیس پونڈ کے درمیان آنکی جبکہ یہ سامان اس نے آٹھ دس مہینے پہلے بارہ سو پونڈ میں خریدا تھا۔ اسی حساب سے اس نے دوسرے فرنیچر کی قیمتوں کا بھی اندازہ لگایا۔

یہ سارا سامان اگلے دن سہ پہر کے وقت وہاں سے اٹھ جائے گا اور آنے والی اتوار کو کوڑیوں کے مول نیلام کردیا جائے گا۔

اسی آنے والی اتوار کو شام کے وقت منظور اس گھر سے بیدخل کر دیا جائے گا۔ مکان پہلے ہی سے رہن تھا۔ کونسل کے ملازمین اور اسپتال کے خدمت گار اسے پکڑ لے جائیں گے جہاں سے اسے کسی سرکاری محتاج گھر میں منتقل کر دیا جائے گا۔ گاڑی بھی جیسی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی ہی سہی۔ قرق امین کے کارندے گھسیٹ لے جائیں گے۔

اس دن۔ اس خاص وقت۔ اس کے گھر میں۔ اس کی کونسل کے کارندے اٹھا پٹخ میں مصروف تھے اور منظور اپنے پورے جمع خرچ کا حساب لگا رہا تھا۔ سب کچھ چھن جانے' سب کچھ لٹ جانے اور سب سے بیگانہ ہو جانے کے بعد اس کی جیب میں صرف تین پونڈ بچے تھے۔ آج سے 33 سال پہلے وہ اس ملک میں نئی زندگی بنانے کے ارادے سے آیا تھا تو اس وقت بھی اس کی کل پونجی تین پونڈ تھی۔

اسے اپنی بے سروسامانی پر کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اب کرنا ہی کیا تھا۔ اگر کچھ مال دولت یا ملکیت ہوتی بھی تو کس کام کی۔ اسے تو دم توڑنے کے لئے ایک بستر کی ضرورت تھی۔ اب نہ اسے کسی سے کوئی تعلق تھا اور نہ کسی دوسرے کو اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ دوست احباب تو اسی وقت الگ ہو چکے تھے جب اس کی مفلسی کی داستان عام ہوئی۔ خود اسے بھی اب دوستوں' رشتے داروں حتیٰ کہ بیوی بچوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ سب اپنی اپنی دھن میں مست' اپنے مسائل میں غلطاں مختلف جگہوں پر مختلف حالات میں بسر کر رہے تھے۔ منظور خود تو اب کسی ایسے گنے کی طرح تھا جس کا سارا عرق نچوڑ کر باقی ماندہ حصہ جلانے کے لئے کونے میں ڈال دیا گیا ہو۔ جلد ہی اس

خس و خاشاک میں آگ لگا دی جائے گی۔

وہ اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں اسے اب صرف وہ ہی تین دن اور قیام کرنا تھا۔ وہ بند ہو کر ایک بہت ہی غیر معقول ناول پڑھنے لگا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کے حساب سے یہ ظہر کا وقت تھا۔ وہی وقت جب گرمیوں کے لمبے اور تپتے ہوئے دنوں میں وہ خس کی ٹٹیوں سے بند اور خوشبودار اور ٹھنڈے کمروں سے نکلتے۔ لو اور گرمی سے بچنے کے لئے سر کو رومال یا تولیوں سے لپیٹے ہوئے وہ پڑوس کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے۔ اگر جمعہ کا دن ہوتا تو وہ سب لوگ اپنے صاف ستھرے کپڑوں پر عطر خس لگاتے۔ باپ' بیٹوں' بھتیجوں اور بھانجوں کی ایک پوری صف ہوتی اور وہ ایک شان افتخار سے اپنے اللہ کے سامنے حاضر ہوتے۔ دوبارہ ایک بار وہ اسی صف میں پھر شامل ہوا' مگر اب وہ نامکمل تھی۔ قابل فخر اور ناکام بوڑھا۔ ان کا باپ ان میں نہیں تھا۔ یہ صف دوبارہ اس قاعدے اور نظم سے آراستہ نہ ہو سکی۔ کئی بھائیوں نے دوسرے خدا بنائے تھے۔

تو اس روز وہ ظہر کی نماز کے لئے اٹھنے کے بجائے کاہلی سے لیٹ گیا۔ پڑھتے پڑھتے اس پر ہلکی غنودگی طاری ہو گئی۔ اس حالت میں اس نے صائمہ بجیا کو خواب میں دیکھا۔ خواب کچھ اس طرح تھا جیسے کوئی بڑا ہال ہو۔ اس میں چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ اکا دکا قالین بھی بچھے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بڑی تقریب کا اہتمام ہو رہا ہو۔ صائمہ بجیا عروسی کپڑوں میں ملبوس ادھر ادھر تشویش کے ساتھ ٹہل رہی تھیں جیسے مہمانوں کی آمد کی منتظر ہوں۔ ان کے سر پر لچکا ٹکا ہوا سرخ دوپٹہ تھا جس کے آنچل سے ان کا گلابی گلابی چہرہ دہک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی پیازی کنول میں شمع جل رہی ہو۔

منظور نے آگے بڑھ کر بے زاری سے کہا "ابھی تک تو کوئی آیا دایا نہیں۔ میں تھوڑی دیر اور دیکھتا ہوں۔ پھر چلا جاؤں گا"۔ اس کی بات پر صائمہ بجیا خفا ہو کر بولیں "تو پھر کیا ہوگا؟.... میں اکیلی کیا کروں گی---؟"

صائمہ بجیا کی خفگی اور بے چارگی دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا اور واپسی کا خیال ترک کر دیا۔ اسی وقت کسی آواز سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اور وہ بستر پر پڑا ہوا اپنے خواب کے بارے میں سوچنے لگا۔

صائمہ بجیا منظور کی سگی پھوپھی کی بڑی بیٹی تھیں۔ بعض رشتے داروں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ منظور کے بڑے بھائی سے منسوب تھیں۔ لیکن منظور اور صائمہ بجیا کی دوستی میں ان افواہوں کا کوئی اثر نہ تھا کہ وہ اس کی ہونے والی بھابھی تھیں۔ تھوڑے دنوں بعد صائمہ بجیا کی شادی عزیزوں میں ہی کسی دوسری جگہ ہو گئی۔ ان کے شوہر منظر بھائی ہر طرح معقول اور مثالی شوہر تھے۔ سب کا خیال تھا کہ یہ شادی بہت کامیاب رہی۔ منظور عمر میں صائمہ بجیا سے کم از کم چھے سال چھوٹا تھا۔ جب وہ اس کی بھابھی نہ بن سکیں اور منظر بھائی سے ان کی شادی ہو گئی تب بھی ان دونوں کی دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اسی طرح کی دلچسپ دوستی منظر بھائی سے بھی ہو گئی۔

صائمہ بجیا تو اس سے بڑوں کی طرح تم تم کر کے باتیں کرتی تھیں۔ مگر منظر بھائی ہمیشہ اس سے آپ جناب کر کے باتیں کرتے۔ ان تینوں کی بے تکلفی اور دوستی میں کبھی یہ ذکر نہ آیا کہ صائمہ بجیا جو اس کی بھابھی ہونے والی تھیں کس طرح محض ایک دور کی عزیزہ بن کر رہ گئیں۔ اصل میں یہ مسئلہ ان کے بیچ کبھی اٹھا ہی نہیں۔ منظر بھائی

ہمیشہ ان لوگوں کے بہت قریب رہے۔ قریبی رشتے داروں میں عام طور پر محبت یگانگت کے باوجود کسی نہ کسی طرح کی لاگ ڈانٹ یا مقابلہ ضرور رہتا ہے۔ منظور کو یہ سوچ کر تعجب ہو رہا تھا کہ ان سب میں اس طرح کا کوئی مقابلہ یا رقابت وغیرہ کا کوئی جذبہ کیوں نہ رہا۔ دوسرے رشتے داروں میں کسی نہ کسی طرح چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز ضرور رہتا تھا لیکن منظر بھائی اور صائمہ بجیا سے اس کی دوستی اور بے تکلفی کے باوجود کبھی مقابلے یا شک و حسد وغیرہ کا کوئی سوال کبھی نہیں اٹھا۔ منظر بھائی کے چھوٹے بھائی بہن بھی تھے اور صائمہ بجیا کا بھی ایک چھوٹا بھائی تھا اس کے باوجود وہ دونوں اپنے سگے بھائیوں سے زیادہ منظور کی ہمت افزائی کرتے۔ صائمہ بجیا ہمیشہ مفید مشورے دیتیں۔ کہتیں یہ کر لو' وہ کر لو۔ اس طرح لکھو اس طرح پڑھو۔ وہ منظور کا نتیجہ دیکھ کر ہنستیں اور جھوٹ موٹ خفا بھی ہوتیں۔ ہمت بڑھاتیں' سخت محنت کرنے اور اچھے نمبر لانے کی تلقین کرتیں۔ جب اسے بی اے میں تھرڈ ڈیژن ملا تو خوب ہنسیں اور مذاق اڑایا۔ یہ' یہ' تمہارا کارنامہ ہے؟ اسی تھرڈ کلاس کے برتے پر ہم پر اپنی قابلیت کا رعب جماتے تھے۔ لیکن اسی دن تھوڑی دیر بعد انہوں نے منظور کی بی اے میں کامیابی پر آموں کی پارٹی کی۔ منظور نے اعلیٰ نمبروں سے ایم اے پاس کرنے کا وعدہ کیا۔ ایسا ہوا بھی۔ مگر جب اس نے امتیاز کے ساتھ ایم اے پاس کیا تب تک منظر بھائی مقامی مشکلوں کی وجہ سے اور پھر ملک کے حالات سے بیزار ہو کر کراچی چلے گئے۔ صائمہ بجیا بھی ہجرت کر گئیں۔ وہ کراچی جا بسیں۔ کچھ اس طرح کہ ان لوگوں کے درمیان کوئی بہت بڑی' بہت گہری اور ان دیکھی خلیج حائل ہو گئی۔ صائمہ بجیا کو تو شاید یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس نے ایم اے پاس کیا یا کس طرح کا امتیاز حاصل کیا۔

برسوں۔ بلکہ ایک طرح صدیوں کے بعد وہ کسی کام کے سلسلے میں پاکستان گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ وہ ڈھونڈھتا کراچی کی اس بستی میں جا پہنچا جہاں صائمہ بجیا نے مکان بنوایا تھا۔ ان دنوں وہ بہت بیمار تھیں مگر تمام عزیزوں اور دوستوں میں وہ واحد تھیں جس نے منظور کے ہوٹل میں ٹھہرنے پر خفگی ظاہر کی اور کہا کہ ہمارے گھر آ کر ٹھہرو۔ منظور کے پاس بالکل وقت نہ تھا اس لئے رسمی باتوں کے علاوہ کوئی بات نہ ہو سکی۔ وہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے تک ہی وہاں رکا اور اسی شام کی پرواز سے واپس ہوگیا۔ کئی برس بعد پھر اسے کراچی جانا پڑا۔ اس بار اس کے پاس خاصا وقت تھا مگر صائمہ بجیا وہاں نہیں تھیں۔ منظر بھائی خود بھی کمزور سے تھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ مگر ان کی کمزوری عمر کی وجہ سے نہیں تھی۔ کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھی یہ کمزوری ان کی تنہائی اور دل شکستگی اور زندگی کے باقی ماندہ سفر میں تنہا تنہا چلتے رہنے کی کمزوری تھی۔ صائمہ بجیا کے انتقال سے وہ بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔ یہ اکیلا پن بہت ذاتی' قلبی اور ذہنی تھا۔ ورنہ گھر تو ماشاء اللہ بیٹوں' بہوؤں اور پوتوں پوتیوں سے بھرا تھا۔

منظر بھائی اکیلے تھے' وہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں پلے بڑھے پھر شادی کرنے لکھنؤ آ گئے۔ وہاں کے آس پاس کی فضاؤں میں انجانے تعصبات و توہمات قدم قدم پر دامن کشاں تھے۔ وہ کراچی میں ایک گوشہ ویراں کے بستر پر پڑے ہوئے سوچ رہے تھے' میں کون ہوں۔ یہاں کیوں ہوں؟ یہی استفہامیہ لفظوں کی صورت میں اس طرح صورت پذیر ہوا "آپ لوگ جو وہاں جا بسے ہیں ان کی.... میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی حیثیت کیا ہے؟"

منظور نے بے اختیارانہ کہا "آپ سے بہت بہتر۔ ہم مشرقی ہیں۔ مسلمان ہیں.... اور..... وہ رک گیا۔ بروقت

زبان کو لگام دے دی۔

منظر بھائی بھی چپ ہو گئے۔ وہ ڈرے ڈرے تھے۔ سہمے ہوئے تھے' وہ لفظ مسلمان کے معنی بھول چکے تھے۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ انہوں نے پہلے بھی ہزاروں بار سوچا تھا کہ "میں کون ہوں' کیوں ہوں۔ اس صدی کے ہنگام نزع یہاں میرے وجود کا جواز کیا ہے"۔

وہ بستر پر پڑا رہا۔ وہ اپنے خواب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے سوچتے سوچتے صائمہ بجیا کو خواب میں دیکھنے کی توجیہہ کی۔ وہ ہمیشہ اور ہر موقع پر اس کا دل بڑھاتی تھیں۔ ناکامیوں پر مایوس نہ ہونے اور کامیابی پر دماغ نہ خراب ہونے کی تلقین کرتی تھیں۔ ہمیشہ کہتیں "کوشش کرو' کوشش۔ جو بھی چاہو اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کر سکتے ہو۔ جو لوگ دنیا میں نمایاں کام کرتے ہیں یا علم و فن میں مرتبے حاصل کرتے ہیں وہ پیغمبروں یا ولیوں کی طرح خدا کے خاص بندے نہیں ہوتے ہیں' وہ سب ہماری تمہاری طرح کے عام لوگ ہوتے ہیں ان کی بڑائی یا اہمیت صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ دل شکستہ نہیں ہوتے۔ برابر محنت کرتے رہتے ہیں' اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ تم بھی کوشش کرتے رہو۔ محنت کرو۔ محنت۔ کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ ہو"۔

صائمہ بجیا اس طرح تو اپنے سگے بھائی کی بھی ہمت افزائی نہیں کرتی تھیں اسی لئے اسے بھی خیال رہتا تھا کہ اگر کبھی پیچھے رہ گیا' اگر کسی امتحان میں فیل ہو گیا تو صائمہ بجیا کو کتنی مایوسی ہوگی۔ وہ تو مجھے اس طرح دیکھتی ہیں گویا میں ناکامی کے لئے بنا ہی نہیں ہوں۔

وہ انٹر میجیٹ کے زمانے میں ایک لڑکی کی طرف ذرا دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ وہ لوگ مالی طور پر اچھی خاصی حیثیت کے مالک تھے۔ صائمہ بجیا کو ذرا اندازہ ہو گیا تو ایک بار ادھر ادھر کی باتیں کرتے کہنے لگیں "کہاں ان فضول چکروں میں پڑے ہو۔ اپنے کام میں لگے رہو۔ لکھنے پڑھنے میں امتیاز حاصل کرو' ان کی جیسی کتنی ہی لڑکیاں ہر وقت تمہارے آگے پیچھے پھریں گی--- یاد رکھو! دنیا کی ہر عورت صرف کامیابی کی قدرداں ہوتی ہے۔ سب عورتیں صرف کامیاب لوگوں ہی میں دلکشی محسوس کرتی ہیں۔ یہ بات میں عورت ہونے کے باوجود کہہ رہی ہوں۔ جذبہ' خلوص' محبت اور حدیث دلنوازی وغیرہ صرف شاعروں کی باتیں ہیں۔ کیا تم نے کسی ایسی عورت کو دیکھا ہے جو امیروں اور چمکتے دمکتے گھرانوں کو چھوڑ کر غریبوں سے نبھانے پر تیار ہو؟

وہ زمانہ دوسرا تھا۔ منظور جوان تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس یا تیئس برس رہی ہوگی' اس لئے وہ خاصا آدرش وادی بھی تھا۔ اس کے باوجود صائمہ بجیا کی باتوں کو سرسری طور پر نظر انداز نہ کر سکا۔ بعد میں تو اسے صائمہ بجیا کی باتیں بہت شدت سے یاد آتی رہیں کیونکہ اپنی تمام کوششوں اور محنتوں کے باوجود وہ ناکام رہا۔ زندگی کی چمکتی دمکتی نمائش گاہ میں وہ کوئی قابل قدر دوکان نہ سجا سکا۔ تمام خاراشگافیوں کے بعد بھی وہ دوسرے اور تیسرے درجے سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ اسی وجہ سے کبھی کوئی صاحب عقل و ہوش لڑکی اس میں دلچسپی نہ لے سکی۔ صائمہ بجیا کی ایک بات تو عشائے ربانی کے فرمودات کی طرح سچی ثابت ہوئی کہ "دنیا کی ہر لڑکی بلا استثناء صرف کامیاب لوگوں میں ہی دلچسپی رکھتی ہے"۔

ایک بار اس کی کسی رشتے کی بہن نے ایک کامیاب اور سماجی اعتبار سے معتبر گھرانے کے لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے رشک سے کہا۔ ان کے سب بھائی بھی بہت اسمارٹ ہیں.... ہر کھیل کود اور مقابلے میں آگے.... ہمارے کوئی بھائی اسمارٹ نہیں ہیں۔

ہماری بہنیں کون سی بڑی.... منظور نے جل کر کچھ کہنا چاہا مگر سنبھل گیا۔ صائمہ بجیا نے معقولیت سے بات سنبھالی اے بی بی۔ تمہارے بھائی زندہ ہیں۔ یہی بڑا کارنامہ ہے۔ حرام کی کمائی پر تو سبھی اسمارٹ بن سکتے ہیں---

حلال' حرام یہ سب کیا ہوتا ہے۔ اصل شے تو ظاہری چمک دمک ہی ہوتی ہے۔ منظور کو اپنی ساری کمزوریوں اور ناکامیوں کا سبب یاد آگیا۔ وہ تاریخی اور آخری جملہ جو ماں نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا "خبردار۔ حرام کی کمائی نہ کھانا' ورنہ دودھ نہیں بخشوں گی"۔

حرام کی کمائی۔ مگر اس سے مفر کہاں۔ نتیجہ تو وہی ہوتا ہے جو.... نیچے گھر میں قرق امین سامان ضبط کرنے کے لئے فہرست بنا رہا تھا۔

اس نے اٹھ کر عصر کی نماز پڑھی۔ صائمہ بجیا کے لئے دعائے مغفرت کی اور اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچنے لگا۔ جیب میں کل پونجی تین پونڈ تھے۔ اچانک اسے یاد آیا الیگزنڈر ڈیوما۔ اس کے ہاتھ میں بھی صرف تین سکے تھے۔ وہ یہی تین سکے لے کر قسمت آزمانے نکلا تھا اور آخری روانگی کے وقت اس کے ہاتھ میں بھی کل تین ہی سکے تھے.... مگر....

درمیانی مدت میں ڈیوما یورپ کا کامیاب ترین ادیب اور ناول نگار رہا تھا۔ یورپ کے مختلف ملکوں کی سرحدوں پر سرکاری کارندے اس کے دستخطوں کو پاسپورٹ جیسی اہمیت دیتے تھے۔ ایک بار اس نے غصے میں کسی سرکاری افسر کو خط لکھا تھا' اس نے ڈیوما کے خط کو فریم کروا کر نیلام کر دیا اور اتنی رقم ملی کہ مدتوں اطمینان سے گھر بیٹھ کر کھانے کا انتظام ہو گیا۔ منظور کی جیب میں بھی اس ملک میں آتے وقت تین سکے تھے اور 33 سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد زندگی کی اس شام پر اس کی جیب میں ڈیوما کی طرح تین سکے تھے۔ ہاں درمیانی مدت میں ڈیوما کی طرح کی شہرت یا تخلیقی کارناموں کی کوئی فہرست اس کے ساتھ نہ تھی۔

ہند قدیم کے ایک محصور راجہ کو دو فوجی پلٹنوں کا انتظار تھا ایک وہ جو بطور کمک آنے والی تھی۔ وہ اسے قلعے کے محاصرے سے نجات دلا سکتی تھی۔ دوسری وہ جو قلعے کا گھیرا تنگ کرکے اس کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے آنے والی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کون سی پلٹن پہلے پہنچے گی۔ راجہ نے اپنے سیدھے ہاتھ کی رگ کاٹ ڈالی اسے خیال ہوا کہ اگر بچانے والی کمک پہلے آگئی تو وہ اس کی رگ جوڑ دے گی۔ خون رک جائے گا۔ ورنہ قطرہ قطرہ لہو بہتا رہے گا۔ قلعے کی شکست اور اس کی گرفتاری سے پہلے ہی وہ آزاد ہو چکا ہوگا۔

منظور نے اپنی کلائی کی رگ کاٹ ڈالی۔ اب دھیرے دھیرے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"کیا صائمہ بجیا اب بھی اپنے بھائیوں کی کامیابی پر یقین رکھتی ہوں گی؟ وہ بھائی جو سب نکمے اور ناکام رہے۔ وہ جو نئی شاخوں پر آشیانے نہ بنا سکے یا وہ جو آشیانوں کو ہی نہیں بلکہ کار آشیاں بندی ہی کو مہمل سمجھتے رہے اور پھر وہ

جو شاخوں کو ہی نہیں بلکہ خود درختوں کو بھی بیخ و بن سے اکھاڑنے کی مخلصانہ کوششوں میں مصروف رہے"۔

قرق امین نے آواز دے کر مطلع کیا کہ اب اسے کوئی سامان چھونے یا استعمال کرنے کا حق نہیں تھا۔ یہ سب چیزیں کونسل کی ملکیت ہیں۔ اگلی اتوار کو نیلام ہو جائیں گی۔ منظور کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ اس نے کچھ سنا بھی کہ نہیں۔

اس کی کٹی ہوئی رگ سے قطرہ قطرہ لہو ٹپک رہا تھا۔ دور سے بگل بجنے کی آواز تو سنائی دے رہی تھی مگر نہ معلوم ہو سکا کہ کس قسم کی فوجی پلٹن کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔

❀ ❀ ❀

انور سدید کی نئی کتاب

ادب کہانی 1996ء

ایک سال کے ادب کی پہلی جامع اور ضخیم کتاب

ضخامت 240 صفحات، قیمت 150 روپے

یہ کتاب مصنف نے خود چھاپی ہے۔ ایک خط لکھ کر اور ڈاک خرچ بھیج کر آپ یہ کتاب مفت بھی منگوا سکتے ہیں لیکن بہتر ہے کہ صرف 100 روپے میں خرید کر پڑھیے۔ ادبی کتاب خرید کر پڑھنا عبادت ہے

مکتبہ فکر و خیال 172- ستلج بلاک اقبال ٹاؤن لاہور 54570

انور سدید کی 1999ء میں آنے والی کتابیں

1- قلم کے لوگ (چند زندہ ادیبوں کے خاکے)

2- دلاور فگاریاں (دلاور فگار کی مزاحیہ شاعری پر پہلی کتاب)

3- ادب کہانیاں 1997 (ایک سال کا جامع اور ضخیم جائزہ)

4- اردو ادب کی مزید تحریکیں (سابقہ سلسلے کی توسیع)

عزیز بک ڈپو اردو بازار لاہور سے دستیاب کتابیں

1- اردو ادب کی مختصر تاریخ — تیسرا ایڈیشن

2- اردو ادب کی تحریکیں — تیسرا ایڈیشن

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

شاہ محمد سبطین شاہجہانی کی زیر اشاعت

تصانیف جو بفضلہ تعالیٰ بہت جلد منظر عام پر آ رہی ہیں

1- مطاف عطا (نعتیہ کلام) — 2- ایوان اولیا (مناقب)

3- آبشار جمال (غزلیات) — 4- قیراط فن (غزلیات)

5- نقوش وطن (قومی و ملی، رزمیہ نظمیں، ورانے)

6- منطقہ افکار (اردو ماہیے)

7- انمول موتی (بچوں کیلئے نظمیں)

رابطہ : **مکتبہ تخلیق**

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور 54000

حاوی پرنٹرز 202/99 آئی ایٹ فور اسلام آباد 44000

گرہ

عذرا اصغر

انہیں گھر سے سدھارے آج چوتھا دن ہی تو گزرا ہے
مگر مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے صدیاں بیت گئیں۔
وہ جانے لگے تو میں نے کہا
"جلدی لوٹ آیئے گا"۔
ان کے بولنے سے پہلے ہی بیٹی بول اٹھی۔
"کیوں۔ بھلا کیوں لوٹ آئیں جلدی۔؟ گھر میں ہوتے ہیں تو آپ لڑتی رہتی ہیں۔ اب میرے ساتھ جا رہے ہیں تو آپ کا دل کڑھنے لگا ہے۔ جب میرا جی چاہے گا بھیجوں گی۔ آپ رہیے اطمینان سے"۔ میرا دل بھر آیا اس کا جواب سن کر۔ جی چاہا پھوٹ پھوٹ کے رو پڑوں۔ مگر اپنی بزرگی کا بھرم اب یوں بچوں کے سامنے رونے بھی تو نہیں دیتا۔ میں کیا کہتی؟ چپ ہو رہی۔ بولتی بھی تو آنسو نکل پڑتے۔ وہ تو پہلے ہی ٹوٹے موتیوں کی طرح پلکوں پر دھرے تھے۔ بس چپ چاپ ان کا سامان پیک کرتی رہی۔ لو بھلا میں کب لڑتی ہوں ان سے؟ شکوے شکایات تو آخر انسان کو ایک دوسرے سے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اب میں شکوہ کروں بھی تو کس سے؟ وہی تو بس میرے اپنے ہیں۔ ایک بیٹا اپنے بیوی بچوں میں مگن ہے۔ اس کی اپنی زندگی ہے۔ اپنی مصروفیات ہیں۔ مستقبل کے خواب ہیں۔ کاروباری امور ہیں۔ ان کے مسائل ہیں۔ وہ اپنے مسئلوں میں الجھا ہوا ہے۔ اس کی اب ایک الگ خاندانی زندگی ہے اور میں اس سے کیا کہوں؟ بڑھتی ہوئی عمر کے انسان کے جذبے پانی بھرے چھالوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ذرا ٹھیس پہنچی اور پھوٹ پڑے۔ یوں بھی بیٹے جوان ہو کر ماؤں سے دور ہو جاتے ہیں۔ مائیں گھر کے فالتو پڑے سامان کی طرح ہو جاتی ہیں۔ پرانے بڑے پتیلے۔ بڑے دیگچے۔ کبھی نذر نیاز پکانے کی ضرورت پڑی تو سٹور سے نکال کر دھو مانجھ کر استعمال کر لئے۔ کام نکلتے ہی پھر سے سٹور کے کاٹھ کباڑ میں جا کے دھر دیا۔
میرے دادا کہا کرتے تھے۔

دھی جوئیاں لے گئے' بہویں لے گئیں پوت
اب منوہر یوں کہیں' ہم رہ گئے اوت کے اوت

کیسی سچی بات کہتے تھے وہ؟

بیٹی جب سے بیاہ کر گئی وہ ویسی رہ ہی نہیں گئی تھی' جیسی تھی۔ اسے اپنا گھر' اپنا میاں' اپنے بچوں کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ دو دن کو آتی ہے تو اپنے گھر کی فکر پڑی رہتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو' وہ بھی سچی ہے۔ مگر گلہ تو مجھے بھی ہوتا ہے نا۔ چار برس پہلے میرا آپریشن ہوا تو اپنے گھر بیٹھی فون کرتی رہی۔

"میری ضرورت ہو تو آ جاؤں؟"

"لو' بھلا بتاؤ۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔ کیا اس کا جی نہ چاہا کہ ماں کو ایک نظر آ کے دیکھ جاتی؟ زندگی کا کیا بھروسا۔ کیا پتہ جو سانس باہر نکلا ہے وہ واپس نہ جائے؟ آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے میں خود یاسین شریف پڑھ کر گئی تھی۔ بنا کچھ کہے سب پر الوداعی نظر ڈالی اور دل ہی دل میں خدا حافظ کہا اور اندر چلی گئی۔ صرف میرے جوتے باہر پڑے رہ گئے تھے۔

کون جانے وہ اسی طرح پڑے رہ جاتے؟

تب بھی بس بیٹی یاد آئی تھی جو مجھ سے کوسوں دور تھی۔ یا انہیں دیکھنے کی حسرت رہ گئی تھی۔ وہ بروقت ہسپتال نہ پہنچ پائے تھے۔

وہ آئے تو آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ جانے انہوں نے کیا سوچا ہو گا؟ اظہار کرنا تو وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔ بس یہی بات ہے جو مجھے ان کی سب سے زیادہ کھٹکتی ہے۔ میرا من مچلتا ہے۔ جی چاہتا ہے وہ مجھ سے ایسی بات کہیں جسے سن کر خوشی سے میں پاگل ہو جاؤں۔ مگر وہ تو گونگے ہیں۔ پتا نہیں محبت کرتے بھی ہیں یا نہیں۔ محبت ہو تو اس کا اظہار تو ہو ہی جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں "کیا میرے عمل سے تم اندازہ نہیں لگا لیتیں؟ پھر زبان سے کہنا ضروری ہے؟ یہ تو بیحد عامیانہ پن ہے کہ انسان زبان سے اظہار محبت کرے"۔

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟"

"محبت کے اظہار میں یہی تو کہنا ضروری نہیں کہ "مجھے تم سے محبت ہے" اور بھی تو بہت سے لفظ ہیں مثلاً

"تمہارے بغیر زندگی کتنی ادھوری لگتی ہے بیوی"۔

"آج تم نے کھانا کتنا لذیذ پکایا ہے؟ مزا آ گیا"۔

"یہ سوٹ تم پر خوب جچا ہے بھئی"۔

یا "آج تم نے لپ سٹک نہیں لگائی۔ کیوں بھلا؟"

مگر وہ تو ایسے بے نیاز ہیں جیسے کچھ دیکھتے ہی نہ ہوں۔ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی گویا آنکھیں نہیں رکھتے۔ منہ میں زبان تو ہے ہی نہیں۔ یوں بولنے لگیں تو ایسے باتیں کریں گے کہ دوسرے کو بولنے نہیں دیں گے۔ بس محبت کے اظہار میں گنگ ہیں۔ میں کہتی ہوں جو عورتیں گھر سے نکل جاتی ہیں۔ شوہروں کو چھوڑ دیتی ہیں' وجہ یہی ہوتی ہو گی۔ عورت ہر لمحہ اپنی تعریف سننے کی متمنی رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ محبت کی بھوکی رہتی ہے۔ ترسی ہوئی' بھوک سے بلکتی' جہاں کسی نے لفظوں کا دانہ ڈالا' وہ چگنے بیٹھ گئی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ دانہ دنکا اسے گھر کے پنجرے میں ملتا

رہے۔ مگر شوہر لوگ ایسا کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ عورت کو نکاح کے کھونٹے سے باندھ کے باہر کسی "ہرا" گائیوں کے چارے پانی کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ ایسی باتوں پر بحث اور احتجاج کو اولاد لڑائی پر محمول کرتی ہے۔ اور بھئی دل کے سکون کی خاطر کبھی کبھار لڑ بھی لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ غبار دل دھل جائے تو دل کا آسمان نکھر جاتا ہے اور محبت کے آنگن میں خوشگوار دھوپ پھیل جاتی ہے۔ ویسے میں نے ان کو کب برا کہا ہے۔ وہ تو ہیں ہی لاکھوں میں ایک۔ بڑے مہمان' بہت دل والے۔ میں کچھ بھی کرتی پھروں' وہ کبھی باز پرس نہیں کرتے۔ شعری نشستیں ہوں یا ادبی محفلیں وہ کبھی نہیں روکتے ٹوکتے۔ خود نہیں بھی جائیں گے تو مجھے چھوڑ آئیں گے۔ واپسی پر میں کسی جان پہچان والے کے ساتھ گھر آؤں گی تو بھی اعتراض نہیں کریں گے بلکہ وہ تو یہ تک نہیں پوچھیں گے کہ میں کس کے ساتھ آئی ہوں۔ میں ایسی باتوں پر خوش نہیں ہوتی' چڑ جاتی ہوں اس بے توجہی پر۔ انسان کسی کو اپنا سمجھتا ہے تو روک ٹوک کرتا ہے نا' جیلسی بھی ہوتا ہے' نفرت اور محبت انسان کی فطرت ہے۔ بے نیازی' لاتعلقی ان کے واسطے ہوتی ہے جن سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ ان کی بے نیازی مجھے یہی احساس دلاتی ہے۔ انہیں اگر مجھ سے نفرت نہیں ہے تو محبت بھی تو نہیں ہے نا۔ میں انہیں پسند ہی نہیں آ سکی ہوں۔ جانے ان کے من مندر میں کس معیار کی لڑکی ہو گی۔

شادی کے پہلے روز' پہلی رات وہ کمرے میں آئے تو لمبے گھونگھٹ کی اوٹ سے میں ان کا خوبصورت پیر ہی دیکھ سکی تھی۔ سفید باٹا کے سلیپر میں وہ سانولا پاؤں مجھے آج بھی یاد ہے جسے دیکھ کر میرا دل اچھل کے میرے حلق میں آ پھنسا تھا۔ پہلی بار اکیلے' بند کمرے میں کسی مرد کا وجود مجھے سما رہا تھا۔ میں نے دل سے کہا "یہ تو میرے اپنے ہیں"

وہ آہستہ آہستہ چلتے میرے پلنگ کی پٹی آ بیٹھے اور میرا گز بھر لمبا گھونگھٹ الٹ دیا۔ میرا دل پلکوں پر دھڑکنے لگا۔ وہ بولے۔ صرف ایک لفظ۔ ایک جملہ "اف اتنی معصومیت۔ اتنا بھولپن"۔

جانے یہ تعریف تھی یا برائی۔ مگر میں نے اس جملے کو تعریف ہی جانا۔ یادوں کے در کھل گئے اور خوشی سے میں رونے لگی۔ لمبے لمبے آنسو دیکھ کے وہ ڈر گئے اور اچھل کر دور جا کھڑے ہوئے پھر قریب آئے۔ سہمے سہمے' کرتے کی جیب سے رومال نکال کر میرے بہتے آنسو پونچھنے لگے۔ بولے:

"دیکھو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں' تمہارے تقدس کو پامال نہ کروں گا اور بہت جلد تمہیں آزاد کر دوں گا۔ تم جب تک میرے پاس رہو گی اس کی امانت رہو گی جسے تم نے دل میں بسایا ہوا ہے۔ میں ہر الزام خود اٹھا لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ بس اب رونا بند کرو اور آرام سے سو جاؤ۔ اور ہاں! یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔ سمجھیں؟"

"ارے واہ! میرے دل میں کوئی نہیں بستا وستا"۔ میں نے اپنے مہندی رچے الٹے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے جھلا کے کہا۔

وہ اور بھی حیران ہوئے۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر پھیلاتے ہوئے بولے۔

پھر روتی کیوں ہو؟"

"ابا جو یاد آ گئے تھے" میں نے سسکی بھری۔

"اس رات سے ابا جی کا کیا تعلق؟" وہ مزید حیرت سے بولے۔

"یہی جو آپ نے کہا"۔ میں سسکیاں بھرتی رہی۔

"کیا؟" وہ حیرت زدہ رہے۔

"وہ کہتے تھے' میری بیٹی کے چہرے پر کتنی معصومیت اور بھولپن ہے۔ جی چاہتا ہے اسے کبھی اپنے سے دور نہ کروں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے' جانے اسے کیسا آدمی ملے گا۔

"وہ ہنس پڑے۔ کہنے لگے تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں کچھ اور سمجھ بیٹھا تھا"

"کیا سمجھے تھے آپ؟"

"یہی کہ شاید تم کسی اور کو چاہتی ہو۔ کسی کو پسند کرتی ہو اور زبردستی مجھ سے بھیڑ دی گئی ہو"۔

خیر پسند تو مجھے کئی لوگ ہیں اور جو پسند ہوتے ہیں ان سے شادی تھوڑی ہو سکتی ہے"

"مثلاً"۔ وہ تکیہ گھسیٹ کر میرے سامنے لیٹ گئے۔

"مثلاً اپنے بھائی' اپنے کزن' اپنے رشتہ دار اور اپنے استاد"۔

وہ اتنے زور سے ہنسے کہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی کو روکنا پڑا۔

"بڑی باؤلی لڑکی ہو تم تو" وہ بولے اور پھر ہماری دوستی ہو گئی۔ وقت مزے سے گزرنے لگا۔ اگلے برس منو پیدا ہوا۔ اس کے بعد گڈو آیا۔ پھر پنکی اور پھر بچوں میں گھر کے مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ انہوں نے کبھی اظہار محبت کیا بھی ہے یا نہیں کیا۔ یہ تو جب پنکی بیاہ کے اپنے گھر چلی گئی۔ منو باپ بن گیا اور گڈو پڑھنے کے لئے باہر چلا گیا تو میرا جی چاہا وہ مجھ سے کچھ کہیں۔ میری تنہائی کو بانٹیں۔ پہلے میں سب کی ضرورت تھی۔ اب میں ضرورت مند تھی۔ پہلے میں چاہت بانٹتی تھی اب خود میں چاہت کی خواہش مند تھی۔ میں نے کہا۔

"دیکھو جی! سب اپنی بیویوں کی تعریفیں کرتے ہیں"۔

وہ بولے۔ "تو پھر؟ میں کیا کروں"۔

میں نے کہا۔ "آپ بھی کبھی بھولے بھٹکے سے کچھ کہہ دیا کریں"۔

کہنے لگے۔ کیا میرے رویے سے اندازہ نہیں ہوتا تمہیں؟"

میں نے کہا۔ میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں"۔

مگر توبہ کیجئے۔ زمیں جنبد نہ جنبد _____ عجیب مٹی کا مادھو شخص ہے۔ پر اپنے اس دل کا میں کیا کروں؟ زیادہ احساس تو مجھے اس وقت ہوا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بدگمانی مجھے س وقت ہوئی جب شہناز ہماری زندگی میں آئی۔ جی ہاں ہماری۔

وہ ہم دونوں پہ اثر انداز ہوئی۔ انہیں شہناز پسند آگئی یا وہ شہناز کے دل میں اتر گئے۔ بات تو ایک ہی ہے۔ وہ کیسی عورت تھی۔ مگر تھی ایسی کہ ان پر اس کا جادو چل گیا۔ ہمارا ستائیس برس کا ساتھ۔ محبت' خدمت' اپنائیت سب ریت کے بھربھرے گھروندے کی طرح ڈھے گیا۔ وہ دونوں آپس میں ملتے رہے۔ ملنے کے لئے حوالے نکل ہی

آتے ہیں۔ میں ہنس ہنس کے ٹالتی رہی۔ نظر انداز کرتی رہی۔ میرے اعتراضات کے مقابل جواز بہت تھے۔ شہناز کے گھر کے مسائل وہ سلجھاتے جو شہناز ان کے سامنے پیش کرتی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنا سر کھپاتے۔ وہ ایسے ایسے نفسیاتی نقطے اسے بتاتے۔ اس کی صحت کے لئے فکرمند ہوتے۔ اس کے میاں کو برا بھلا کہتے جو اسے آہستہ آہستہ تنہائی کے غار میں دھکیل رہا تھا۔ وہ اصرار سے کہتے۔

"تمہارے میاں کو تمہارے شوق شیئر کرنے چاہئیں"

میں ایسے موقعوں پر تو چپ رہتی۔ ایک دن پوچھ بیٹھی۔

"میاں جی شہناز کی اتنی فکر ہے آپ کو۔ اپنے گھر کی طرف بھی دیکھو۔ کیا تم وہی کچھ نہیں کر رہے ہو؟"

مگر وہاں ایک چپ سو کو ہرائے۔ جی چاہا اپنا سر کسی پتھر سے دے ماروں۔ مگر وہ بھی ایک پتھر ہی تو ہیں جن سے ٹکرا کر میں پاش پاش ہو رہی ہوں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہوا۔ ایک دن بولے۔

"ایبٹ آباد جانا ہے"

کیوں؟" میں نے پوچھا۔ میں نے سوچا تھا وہ کہیں گے۔ موسم اچھا ہے اور عرصے سے کہیں گئے بھی نہیں' ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی"۔ مگر وہ بولے۔

"تم بھی چلو گی"۔

"مگر کیوں آخر؟ کچھ تو پتہ چلے سلسلہ کیا ہے"۔ وہ مسکرائے۔ کہنے لگے۔

"میرا فلاں دوست ہو گا اور اس کی بیوی۔ اسی کی گاڑی پر چلیں گے اور ____" وہ رکے۔

"اور ___؟"

"شہناز" وہ بولے۔

"شہناز کیوں"۔ اندر سے تو مجھے بہت غصہ آیا مگر میں نے ضبط سے کام لے کر پوچھا۔

بولے "اس کا ایک انٹرویو ہے"۔

"انٹرویو ہے تو وہ خود چلی جائے گی' آپ سے کیا مطلب؟" میں نے جل کر کہا۔

نرمی سے بولے۔

"بھئی میں نے ہی تو اس کے لئے جاب کا بندوبست کیا ہے۔ میرے ایک جاننے والے کا سکول ہے اس میں"۔

قہر درویش بر جان درویش۔ مجھے جانا پڑا۔ واپسی پر دوست اور ان کی بیوی ٹیکسلا پر رکے۔ میں نے کہا۔

"میں بھی کچھ گملے لے لوں"۔

فراخ دلی سے بولے۔ "ہاں ہاں لے لو"۔

میں نے کہا "آپ بھی چلئے نا میرے ساتھ"۔

بیزاری سے بولے۔ "بھئی مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم لے لو جو جی چاہے"۔

اس دن میں اکیلے ہی گملے خریدتی رہی اور میرا جی بھر بھر آتا رہا۔ وہ شہناز سے باتوں میں مگن تھے۔

میں ڈکی میں گملے رکھوانے لگی تو وہ دونوں چپ سے ہو گئے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ کچھ خاص باتیں ہو رہی تھیں جو مجھے آتا دیکھ کر بند کر دی گئی ہیں۔ گھر پہنچ کر بولے۔

"پرسوں کو پھر ایبٹ آباد جانا پڑے گا"۔

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"شہناز کو جوائن کرانا ہے"۔

"آپ کا کیا کام۔ کیا جوائننگ رپورٹ آپ کو دینی ہے؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

"بس وہ اصرار کر رہی تھی کہ آپ ضرور چلیں گے" وہ بولے۔

"تم بے شک نہ جاؤ"۔

"یہ اصرار کب ہوا؟ اور میں کیوں نہ جاؤں؟" میں نے ترشی سے پوچھا۔

"جب تم گملے خرید رہی تھیں۔ اور چلنا چاہو تو چلو مگر ہم ویگن سے جائیں گے"۔

"آپ جائیے' ویگن میں ایک سیٹ پر دو ہی سواریاں تو بیٹھ سکتی ہیں اور ویسے بھی میں کیوں ویگنوں میں دھکے کھاتی پھروں"۔ لاپروائی سے میں نے کہا۔

اطمینان سے بولے۔ "جیسی تمہاری مرضی"۔

"لیکن میں اگر آپ کو بھی جانے نہ دوں؟" میں نے کہا۔

بولے۔ مجھے تو ضرور جانا ہے۔ میں وعدہ کر چکا ہوں"۔

"وعدے تو آپ اور بھی بہت سے کر سکتے ہیں' جائیے"۔ میں روہانسی ہو گئی مگر ضبط کر گئی۔ میں کمزوری کیوں دکھاتی۔

وہ لہجے کو نرم بناتے ہوئے بولے۔

"اصل میں اس نے بڑی منت کی تھی۔ بچاری رو بھی پڑی تھی۔ بس میں نے وعدہ کر لیا۔ مجھے پتہ تھا تم مائنڈ نہیں کرو گی"۔

"جناب میں شدت سے مائنڈ کروں گی' اور سن لیجئے' آپ گئے تو پھر واپسی پر یہ گھر مجھ سے خالی ہو چکا ہو گا"۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ لاپروائی سے بولے۔

"یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔ مجھے بہرحال اپنا وعدہ نبھانا ہے"۔

وہ بستر پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔ مگر میرا دماغ بھبھک رہا تھا۔ مجھے کسی کروٹ قرار نہیں آرہا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کے لئے میں نے اپنا سب کچھ تج دیا۔ اس کی مرضی پر ایسے ڈھل گئی جیسے چاک پہ چڑھا برتن۔ ستائیس برس محبت' اپنائیت کا جتن کرتے گزار دیئے۔ کیا میرا سارا ایثار' قربانی' وفا' سلیقہ سب رائیگاں گیا۔ سوچ سوچ کے میرے دماغ میں بلبلے اٹھنے لگے۔ میرا رواں رواں دھواں دینے لگا۔ رات کے جانے کون سے پہر میں' میں نے اپنا

لحاف اٹھایا اور قالین پر جا کے لیٹ گئی۔

"بس اب اس شخص سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ اس گھر میں یہ میری آخری رات گزر رہی ہے"۔

میں نے خود سے فیصلہ کیا اور سو گئی۔

پتہ نہیں وہ کب باتھ روم جانے کو اٹھے ہوں گے تو میرے لحاف سے الجھ گئے۔ لائٹ جلا کے دیکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بولے

"یہاں ٹھنڈ میں کیوں لیٹی ہو؟"

میں نے کہا "کمر درد کر رہی تھی"۔

انہوں نے زبردستی اٹھا کر مجھے پلنگ پر لٹا دیا۔ اگلے دن میں منتظر رہی ان کی روانگی کی۔

مگر وہ گئے نہیں۔ کہیں بھی نہیں گئے۔ دفتر بھی نہیں۔

بے شک وہ نہیں گئے اور بے شک انہوں نے شہناز کو فون بھی نہیں کیا مگر میرے دل میں گرہ تو پڑ گئی۔ اب ہزار چاہوں تو بھی یہ گرہ نہیں کھلتی۔ بدگمانی آکٹوپس کی نسل سے ہے شاید۔ وہ سامنے ہوتے ہیں تو مجھے لاکھ شکوے رہتے ہیں مگر اب جب وہ بیٹی کو چھوڑنے دوسرے شہر گئے ہیں تو مجھ سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا۔ میں نے فون پر ان سے کہا ہے۔

"بھئی جلدی آجایئے"۔

"کیوں؟" وہ پوچھنے لگے۔

"مجھ سے آپ کے بغیر نہیں رہا جاتا۔ یہ گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے"۔

لو! میں پھر اظہار محبت کر بیٹھی ہوں۔ بیویوں میں یہی تو خامی ہے جو شوہر کو مغرور بنا دیتی ہے۔ یہ ستی ساوتری پن تو مشرقی بیوی کی گھٹی میں گھول کر پلا دیا گیا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے کہیں کہ "بیوی تمہارے بغیر رہنا میرے لئے کتنا مشکل ہے بلکہ ناممکن"۔

مگر میں جانتی ہوں وہ ایسا کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ ایسا ایک لفظ بھی بول دیں تو میرے دل میں پڑی گرہ کھل ہی نہ جائے بھلا!

کراچی میں "تخلیق" ملنے کا پتا

دانشکدہ زہرہ سکوائر ۔ راشد منہاس روڈ ۔ گلشنِ اقبال بلاک ۶ کراچی ۷۵۳۰۰

کھڑکی

محمد سعید شیخ

عروسی کمرہ کی عقبی کھڑکی قبرستان کے جس حصے کی طرف کھلتی تھی، وہاں ایک تازہ قبر کا اضافہ ہوا تھا۔
ابھی اس قبر کی مٹی کا رنگ نمی کی وجہ سے گہرا مٹیالا تھا اور دوسری قبروں کے رنگ سے مختلف نظر آتا تھا۔ اس پر بچھے گلابوں کے جال کے پھول بکھر کر پتیوں میں پھیل رہے تھے اور ان سے ابھی تک اداس خوشبو اڑتی تھی۔
قبر کے بائیں جانب قبرستان کی وہ لمبی دیوار تھی جس نے زندہ لوگوں کی آبادی کو قبرستان کی طرف بڑھنے سے روکا ہوا تھا۔ قبرستان میں چاروں طرف سایہ دار درخت اور کہیں کہیں قبروں کے درمیان سرسبز جھاڑیاں تھیں جن میں بعض جگہ رات کی رانی کے پودے چھپے ہوئے تھے اور چاندنی راتوں میں جب یہ پودے خوشبو سے چھلکتے تھے تو لوگوں کو کہیں نہ کہیں سفید کپڑوں میں کوئی روح بھی دکھائی دے جاتی تھی۔
وہ گلی، جس میں عروسی کمرے والا گھر تھا، پندرہ بیس قدم جا کر ایک آخری گھر پر ختم ہو جاتی تھی، جس کا دروازہ سامنے گلی میں کھلتا تھا۔
ان دونوں گھروں کے درمیان قبرستان کی حد بندی کرنے والی قد آدم دیوار میں چھوٹا پھاٹک تھا جو صبح کھول دیا جاتا تھا اور لوگ قبرستان کے اندر سے گزر کر پرلی طرف واقع گلی جس میں لوگوں نے اپنی بیٹھکوں کو دکانوں میں بدلنا شروع کر دیا تھا، سے ہو کر اس سڑک کو نکل جاتے تھے جہاں سے انہیں تانگے، رکشے، ویگنیں اور بسیں، ان کے کاموں کاجوں پر لے جاتی تھیں۔ رات کو قبرستان والا راستہ بند کر دیا جاتا تھا اور لوگوں کو دکانوں والی پکی گلی کے اوپر سے ہو کر قبرستان کے اس طرف اپنی آبادی میں آنا پڑتا تھا۔
قبرستان کا اصل راستہ اس پکی اور بازار نما گلی میں سے گزرتا تھا جہاں اب مکانوں کے باہر والے حصے دکانیں بنتے جا رہے تھے۔ جب ادھر سے جنازہ گزرتا تھا تو اب لوگ دکانیں بند نہیں کرتے تھے۔ لوگ ذرا دیر نظر پھیر کر جنازے کا منظر دیکھتے اور سودا سلف خریدنے لگتے تھے۔ گلی میں کھلتے گھروں کے دروازوں کی اوٹ سے عورتیں جھانکتی تھیں اور بچے دروازوں کے باہر آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔
زمانہ بدل گیا تھا۔ اب لوگ جنازہ دیکھ کر سہمتے نہیں تھے اور نہ ہی عورتیں، بچے ڈر کر دروازے بند کرتے تھے۔ اور نہ ہی اب کلمہ شہادت کی آواز سن کر لوگوں کے دل دہلتے تھے اور نہ ہی انہیں موت یاد آتی تھی۔ جنازے میں شامل لوگ کلمہ شہادت کی آواز سن کر کچھ منمناتے تھے اور پھر اپنے مسائل کا ذکر شروع کر دیتے تھے۔ سائیکلوں،

موٹر سائیکلوں اور تانگوں ریڑوں کی ٹریفک بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی تھی۔

شمالاً" جنوباً" آبادی کی گلیاں تھیں جن کی عقبی دیواریں قبرستان کے ساتھ لگتی تھیں۔ ان گھروں کے دروازے پرلی طرف تھے اور ان کے مکینوں کو قبرستان کی زندگی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ کبھی کسی کا دل چاہتا تو ہوا خوری کے لئے گھر کی چھت پر چڑھ کر قبرستان میں کسی جنازے کا نظارہ سہولت سے کر سکتا تھا۔

اس بسنت پر جب لوگ چھتوں پر چڑھ کر پتنگیں اڑا کر پیچ لڑاتے اور بوکاٹا بوکاٹا کا شور مچاتے تھے تو بہت سے بچے سوٹیاں' ڈانگریاں لے کر قبرستان میں داخل ہو کر کٹی ہوئی پتنگیں لوٹتے تھے اور قبروں کو پھلانگتے تھے جو ان کی بھاگ دوڑ میں زیادہ مزاحم نہیں ہوتی تھیں۔

بند گلی کے گھر کا وہ کمرہ جسے چند روز قبل حجلہ عروسی بنا کر سجایا گیا تھا۔ اپنے مکان کا پچھلا حصہ ہونے کے باوجود' گھر سے علیحدہ قبرستان میں بڑھا صاف دکھائی دیتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ قبرستان کا ہی حصہ ہو۔ صبح جب لوگ اس کے پاس سے گزر کے جاتے تھے تو اس کمرے کی کھڑکی بند ہو جاتی تھی تاکہ کسی کی نظر اس میں نہ پڑے۔

کمرے میں ابھی تک سہاگ رات کی مہک ٹھہری ہوئی تھی۔ دیواروں اور چھت سے کاغذی پھول' غبارے اور چمکدار گوٹے کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔

شروع شروع میں ثوبیہ یہ کھڑکی نہیں کھولتی تھی۔ اسے قبرستان کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا مگر انیس اس منظر کا بچپن سے عادی تھا۔

ویسے اب انہیں رات کو وہ دروازہ بند رکھنا پڑتا تھا بلکہ اندر سے کنڈی چڑھانی پڑتی تھی' انہیں تازہ ہوا کے لئے قبرستان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھلی رکھنی پڑتی تھی۔

قبرستان سے کیا ڈرنا۔ وہاں کے لوگ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ انیس نے ثوبیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ڈرنا تو زندہ انسانوں سے چاہئے"۔

آہستہ آہستہ ثوبیہ اس منظر کی عادی ہونے لگی اور جب رات کو کبھی ہوا چلتی تو قبرستان کی طرف سے خوشبو کے جھونکے فرفر کمرے میں داخل ہوتے تو چھت سے لٹکتے ربڑ کے غبارے ہوا سے ہلتے' چمکدار کاغذ کی لڑیاں گھومتی ہوئی لہراتیں تو کمرہ مہک اٹھتا۔ لیکن پھر بھی جب وہ انیس کے ساتھ لیٹتی تو کھڑکی کا پردہ پوری طرح کھینچ کر برابر کر دیتی۔

"اس وقت' ادھر کوئی نہیں ہوتا"۔ انیس اسے سمجھاتا۔

جس روز ان کی کھڑکی کے سامنے' املتاس کے زرد خوشوں سے بھرے درخت کے نیچے پتلی' لمبی قبر کا اضافہ ہوا' تو رات کو ثوبیہ نے کھڑکی پر پردہ تاننے سے پہلے' بڑی اداسی سے اس قبر کو دیکھا۔

"تمہیں پتہ ہے انیس۔ اس قبر میں جو لڑکی دفن ہوئی ہے' اس نے خودکشی کی ہے۔"۔

تمہیں کس نے بتایا ہے؟ انیس نے لباس تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

"پڑوسن کا میاں ان لوگوں کو جانتا ہے۔ اس لڑکی کا باپ اور بھائی کسی بوڑھے مالدار شخص سے اس کی شادی

کرنا چاہتے تھے جب کہ وہ لڑکی کسی سے پیار کرتی تھی"۔

"خودکشی کرنے کی بجائے اگر وہ شادی بوڑھے مالدار سے اور پیار اپنی پسند سے کرتی رہتی تو آسانی سے زندہ رہ سکتی تھی۔ آج کل تو یہ کافی رواج ہو رہا ہے"۔

"بری بات ہے انیس۔ مرنے والوں کے متعلق ایسی باتیں"۔

"میں تو اس کے بھلے کی بات کہہ رہا ہوں۔ اب بے چاری قبر میں جو بے چین ہوگی"

انیس ہنستا ہوا۔ اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور باہر قبرستان میں اس تازہ قبر کو دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ میں نے بھی سنا ہے کہ جو لوگ بے قرار مرتے ہیں' ان کی روحیں بھی بے چین رہتی ہیں"۔

"تو چلو۔ بند کر دو یہ کھڑکی۔ کہیں وہ بے قرار روح اندر نہ آ جائے"۔

یہ کہتے ہوئے انیس نے کھڑکی بند کر دی۔ مگر ثوبیہ نے اس کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا رہنے دیا تاکہ ادھر سے ہوا آتی رہی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ گھر والوں کے ساتھ' دوسرے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ انیس کے علاوہ اس کا باپ' ماں اور ایک بہن سعدیہ اس گھر کے مکین تھے۔ سعدیہ نے بڑے شوق سے اپنے بھائی اور بھابی کے لئے عروسی کمرہ سجایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کی ماں نے ثوبیہ کی آنکھوں میں بھری ہوئی نیند دیکھ کر کہا۔ "جاؤ بیٹا۔ دولہن کو نیند آ رہی ہے"۔

"بھابی کی تو نیندیں ہی پوری نہیں ہوتیں۔ بھیا کے جانے کے بعد بھی' دن کا زیادہ حصہ بھابی سو کر ہی گزارتی ہیں"۔ سعدیہ نے شرارت سے اپنی بھابی کو دیکھا' جس نے شرم سے سر جھکا لیا۔ اپنے کمرے میں آتے ہی یہ لوگ سارے گھر سے کٹ جاتے تھے اور انہیں وہ علیحدگی نصیب ہوتی تھی جس کی ثوبیہ کو بہت مدت سے خواہش تھی کیونکہ اس کا اپنا گھر چھوٹا بھی تھا اور اس کے بہن بھائی بھی تعداد میں بہت تھے۔ زندہ اور مردہ ملا کر' اس کی ماں نے نو بچے جنے تھے۔ ہر وقت شور رہتا تھا۔ یہاں خاموشی تھی۔ سکون تھا۔ قبرستان کا سا سکون۔

جب انہوں نے اپنے کمرے کی تمام بتیاں بجھا دیں' پھر بھی اندھیرے میں ہلکی ہلکی روشنی کا احساس ہوتا تھا۔

میری نانی اماں کے پاس ایک تسبیح ہوتی تھی جو اندھیرے میں چمکتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ اسے دیوار پر لٹکا دیتی تھیں۔ وہ ساری رات اندھیرے میں چمکتی تھی۔ جب نانی اماں سو جاتی تھیں تو میں چپکے سے اٹھتا' تسبیح ہاتھ میں لے کر آنکھوں کے قریب لا کر' دیر تک اس کی سبز' ٹھنڈی میٹھی روشنی سے کھیلتا رہتا تھا۔ تمہاری آنکھیں' تمہارے دانت بھی اندھیرے میں چمکتے ہیں۔ نظروں کو طراوت بخشتے ہیں اور تم"۔

"احساسات۔ انہیں بولو مت۔ رہنے دو ایسے ہی"۔

اس سے انیس کو لگا کھڑکی کا جو پٹ تھوڑا کھلا رہ گیا تھا' وہاں سے کوئی انہیں دیکھتا ہو۔ چپکے سے--- خاموشی سے۔

اس نے آہستگی سے خود کو ثوبیہ سے علیحدہ کیا اور چادر لپیٹ کر کھڑکی تک آیا۔ اور پھر ایک جھٹکے سے اس

نے کھڑکی کھول کر پردہ سرکا دیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن بہت قریب۔ وہیں ہوا میں کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے وہیں سے کوئی نکل کے گیا ہو۔ ابھی ابھی۔

گیلی مٹی اور کافور کی تازہ خوشبو ابھی تک وہاں ٹھہری ہوئی تھی۔

فجر کی روشنی جب پھوٹ رہی تھی تو ثوبیہ نہا کر آ گئی اور اس نے اپنے گیلے بال انیس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اٹھیں سرکار آپ گھر والوں کے جاگنے سے پہلے باتھ روم استعمال کر لیں۔ اس کمرے میں یہی ایک کمی ہے کہ اس کے ساتھ باتھ روم نہیں ہے"۔

یار۔ تم یہ رات کو نہا کیسے لیتی ہو۔ تمہیں ٹھنڈ نہیں لگتی؟ مجبوری ہے۔ ابا جی اور امی کے جاگنے سے پہلے نہانا ضروری ہوتا ہے"۔ تاکہ انہیں پتہ نہیں چلے کہ ہم کیسے رہتے ہیں"۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی نظر کھڑکی پر پڑی جو کھلی ہوئی تھی۔ اور پردہ کھلا ہوا تھا۔ حالانکہ اسے یاد تھا۔ اس نے خود کھڑکی بند کر دی تھی۔

اسے حیرت تو ضرور ہوئی مگر اس نے سوچا میں شاید نیند میں تھا' کھڑکی بند کرنا بھول گیا تھا۔

"چلو اٹھو۔۔ نہا کر انسانوں کا لباس پہنو"۔ ثوبیہ نے بازو سے پکڑ کر اسے کھینچا۔

میں تمہیں کیا انسان دکھائی نہیں دیتا؟۔

نہیں۔۔۔ جانور لگتے ہو۔

"اور جب ہم دو جانور لگتے ہوں گے۔ اس وقت"؟ اور وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "اس وقت شاید ہمیں کوئی دیکھتا ہو"۔

اگلی رات بھی اس نے بڑے اہتمام سے کھڑکی کا ایک پٹ بند کیا اور دوسرے پٹ کے آگے اچھی طرح پردہ تان دیا۔

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ اس کا وہم ہے یا کچھ اور۔

اس رات تھکن سے اسے گہری نیند آئی اور رات کے کسی لمحے بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ صبح جاگتے ہی سب سے پہلے اس کی نگاہ اس کھڑکی کی طرف اٹھی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس نے دیکھا' کھڑکی کے کھلے پٹ کا پردہ سرکا ہوا تھا۔ ثوبیہ اس کے لئے چائے بنانے گئی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ قبرستان کے سارے درخت خاموش اور ساکن تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ "تو پھر یہ پردہ کیسے سرک گیا"؟

ثوبیہ چائے لے کر آئی تو اسے کھڑکی کے پاس پریشان کھڑے دیکھ حیران ہو گئی۔

"یہ پردہ تم نے سرکایا تھا"؟ اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ تم نے خود ہی تو آدھی کھڑکی بند کی تھی"۔

تو۔۔ تو پھر یہ پردہ سرک کیسے جاتا ہے؟

"ہوا سے سرک جاتا ہو گا۔ مگر تم اتنے پریشان کیوں ہو"۔

وہ کچھ سوچتا ہوا کھڑکی سے ہٹ آیا۔

اگلی تین چار راتیں اس نے اسی حالت میں گزاریں کہ اسے مسلسل یہ محسوس ہوتا کہ اس کھڑکی کے کسی کونے سے کوئی انہیں دیکھتا ہے۔ اپنی اس پریشانی کا ثوبیہ سے وہ اس لئے ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے وہم کا مذاق اڑائے گی۔ اور گھر والوں کو بھی اس میں شامل کر لے گی۔

اس رات وہ دیر سے گھر لوٹا۔ کھانا بھی اس نے اپنے دوستوں کے ہاں ہی کھا لیا تھا۔ دروازہ اس کی بہن نے کھولا اور جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔ "بھیا کھانا لاؤں"؟

"نہیں۔ میں کھانا باہر سے کھا آیا ہوں"۔

اس کی بہن جمائیاں لیتے سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

انیس عروسی کمرے میں داخل ہوا تو ثوبیہ سفید ساڑھی پہنے' کھلے بالوں میں موتیے کے ہار پروئے' چہرے پر انتظار کے رنگ لئے کھڑی تھی۔

"معاف کرنا۔ ایک دوست نے روک لیا تھا۔ کھانا بھی وہیں کھایا۔ دیر ہو گئی"۔

وہ خاموش رہی۔

جتنی دیر انیس لباس تبدیل کرتا رہا' وہ اس کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی۔

انیس اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ بڑے اداس لہجے میں کہنے لگی۔ "اس لڑکی نے خودکشی نہیں کی تھی' اس کے باپ اور بھائی نے مل کر اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ ان کا کہا نہیں مانتی تھی"۔

"اور تمہیں یہ بات بھی پڑوسن نے ہی بتائی ہوگی"۔

وہ چپ رہی۔

"اور وہ جو بے قرار موت مر جاتے ہیں' ان کی روحیں بے چین رہتی ہیں۔ انہیں قبروں میں بھی قرار نہیں آتا"۔

"ہاں"۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"___ اور جس سے وہ پیار کرتی تھی اس کا نام بھی انیس ہی تھا۔ اگر ان کی شادی ہوتی تو وہ بھی کچھ ایسی ہی زندگی گزارتے"۔ یہ کہتے ہوئے' وہ مڑی اور آ کر بستر پر لیٹ گئی۔

آج بھی یہ عروسی کمرہ مہک رہا تھا۔ اس میں گیلی مٹی کی' موتیے کی اور کافور کی وہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس سے انیس مانوس تھا۔

وہ ساری رات اس سے لپٹی رہی۔ آکاس بیل کی طرح نیم غنودگی کی حالت میں انیس نے کئی مرتبہ دیکھا' کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور پردہ ہٹا ہوا تھا۔ انیس نے ایک دو مرتبہ اٹھ کر پردہ کھولنا چاہا مگر اس نے روک

دیا۔ "یہ کھڑکی کھلی رہنے دیا کرو۔ باہر کی زندگی کا پتہ چلتا رہتا ہے"۔

"مگر ادھر--- ادھر تو قبرستان ہے"۔

"وہ بھی زندگی کا ہی ایک منظر ہے"۔ اس کو یہ بات کہتے ہوئے انیس نے سنا جب کہ اس کے لب ہلتے اسے نظر نہیں آئے۔

"تم آج بہت اداس اداس دکھائی دے رہی ہو"۔ یہ کہہ کر انیس نے اسے باہوں میں بھر لیا مگر آج اس کے وجود کا لمس اس کے جسم میں گھلتا نہیں تھا۔ وہ ہوا کی طرح اس کے بازوؤں سے اڑتی جاتی تھی۔ ایک عجیب سی مست اور مدہوش کر دینے والی خوشبو اور اس کے حواس پر یوں گر رہی تھی جیسے ٹھنڈی برف ہو جو اس کے خون کی حدت میں تیرتی تھی۔ اور اس کے حواس کو بے بس کرتی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا وہ زینہ زینہ کسی خواب میں اترتا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھتی تھیں مگر اس کا وہ جسم جس کی قوتوں پر اسے ناز تھا نیند میں ڈوبنے لگا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اسے قبرستان کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اس کو قبرستان سے اٹھنے والی خوشبو بھی آ رہی تھی اور اس کی سوچ اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

وہ سوتے ہوئے بھی اسے خود سے چمٹے آنکھیں کھولے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ مگر اس کا جسم اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ عجیب سی ناطاقتی اور سرشاری نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

صبح سعدیہ نے باہر سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے جگایا۔ نیند اور تھکاوٹ سے لڑکھڑاتا ہوا وہ اٹھا اور جا کر اس نے دروازے کی کنڈی کھولی۔

آج اتنی دیر کر دی بھیا۔ کام پر نہیں جانا؟

وہ--- ثوبیہ نے اٹھایا ہی نہیں۔

ثوبیہ--؟ ثوبیہ بھابی تو کل شام سے اپنی امی کے گھر گئی ہیں۔ اس کا بھائی آیا تھا اسے لینے۔ اس کی امی کی طبیعت خراب تھی۔ حیرت اور خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے جلدی سے دروازے کے پٹ کا سہارا لیا۔

"مگر رات--- رات تو---"؟ اس نے گھبرا کر اپنے بستر کی طرف دیکھا۔ جہاں سے وہ اٹھا تھا' وہاں ساتھ ہی بستر پر سلوٹیں موجود تھیں۔

"آپ کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں"۔ اس کی بہن نے اس کا رنگ زرد پڑتے دیکھ لیا تھا۔ میں ابھی بھابی کو فون کرتی ہوں۔

جب تک ثوبیہ گھر لوٹی انیس کو کپکپی سے بخار چڑھ چکا تھا۔

"واہ بھئی واہ۔ ایک رات کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکے"۔ ثوبیہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

رات بھر وہ چپ رہا۔ ثوبیہ اس کے جسم کو سہلاتی تھی مگر اس کی رگوں میں کوئی جذبہ نہیں جاگتا تھا۔ عجیب

سا خوف اور مردہ لذت اسی کی رگوں میں دوڑتی تھی اور اس کا جسم پسینے میں بھیگتا تھا۔ وہ بار بار قبرستان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھتا تھا' کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پاتا تھا۔ رات کو آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح دن چڑھے ثوبیہ نے جھنجھوڑ کر اسے اٹھا دیا۔

"دیکھو--- ادھر دیکھو انیس قبرستان میں کیا تماشا ہو رہا ہے"۔

کھڑکی کے سامنے ایک نیا منظر کھلا تھا۔ اس تازہ قبر کے اردگرد ڈاکٹر کھڑے تھے۔ قریب ہی پولیس اور ایک مجسٹریٹ بھی تھا جن کی حراست میں دو آدمی نظر آ رہے تھے ایک جوان اور دوسرا ادھیڑ عمر۔

"___ سناتم نے انیس۔ اس لڑکی نے خودکشی نہیں کی تھی۔ اس کے شوہراور سسر نے اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ اب قبرکشائی ہو رہی ہے۔

"ہاں۔ مجھے پتہ ہے"۔ انیس نے کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا---> ثوبیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں--- ایسے واقعات بہت سنے ہیں۔ اخبارات میں بھی آتے رہتے ہیں۔

سارے قبرستان میں تعفن پھیلا ہوا تھا۔ لوگ دیواروں پر گھروں کی چھتوں پر چڑھے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ قبر کھود کر لاش نکالی جا چکی تھی اور ڈاکٹر اس کے اعضاء کا معائنہ کر رہے تھے۔

انیس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس کھڑکی کو کھلا رہنے دے یا بند کر دے۔

"اردو میں ماہیانگاری" (تحقیق و تنقید) اور

"اردو ماہیے کی تحریک" (مضامین کا مجموعہ) کے بعد

حیدر قریشی کی ایک اور کتاب

ماہیا ___ علمی بحث سے غوغائے رقیباں تک

☆متضاد آراء رکھنے والے سارے مخالفین کے تیروں کا نشانہ ایک ہی طرف کیوں ہے؟ ☆علمی بحث سے فرار کے بعد بہتان طرازیوں کی تفصیل اور ان کی اصل حقیقت ☆کون کب ماہیے میں اچانک دلچسپی لینے لگا ☆کون کس سے ناراضی کے باعث اور کون کسے خوش کرنے کیلئے ماہیے کی علمی بحث میں گرد اڑانے لگا؟ تمام اصل ناموں اور پس منظر میں رہ کر کام کرانے والوں کو مکمل شواہد اور ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ ایک ایسی کتاب جو ماہیے کی تاریخ میں اپنے مخالفین کے کردار کو ان کی زندگیوں میں ہی ظاہر کرے گی اور جس کی موکد بعد اب قسم کھا کر تردید کرنا ان مخالفین کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ (بہت جلد شائع ہو رہی ہے)

نامی انصاری کی اہم کتاب

آزادی کے بعد ___ اردو نثر میں طنز و مزاح

جس میں رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا کے فکر و فن کا تفصیلی مطالعہ اور طنز و مزاح کی ادبی صورتوں کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے

صفحات 220 ___ قیمت 150 روپے

دانش محل

امین الدولہ پارک، لکھنو 226018

پوسٹ مارٹم

صالحہ خاتون

28 مئی 4 بجکر 13 منٹ

فضا زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ کیسا منہ توڑ جواب دیا گیا تھا۔ سمجھ کیا رکھا تھا؟ کیا وہ کوئی چیونٹی تھی جو اتنی آسانی سے مسل دیئے جاتے؟ یا دھماکے کے خوف سے اپنی بلوں میں گھس کر بیٹھ رہتے؟ سر جھکا لیتے-- ہاتھ باندھ لیتے؟ ساتواں در کھل گیا تھا ___ جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت مل گئی تھی۔

کہا گیا۔

"پیٹ پر پتھر باندھ لو" (جن کے پیٹ پر پہلے ہی پتھر بندھے تھے)

"ایک وقت روٹی کھاؤ" (جو پہلے ہی ایک وقت کی روٹی بمشکل مہیا کر پاتے تھے)

"چائے مت پیو" "زرمبادلہ بچاؤ" (وہ جفاکش جو ایک پیالی چائے کے بل پر دوبارہ تازہ دم ہو جاتا تھا مزید جفا کشی کے لئے)۔

امپورٹڈ منرل واٹر کی بوتلیں دھڑا دھڑ بک رہی تھیں اس پہاڑی مقام پر بے پناہ ہجوم تھا۔ چشمے کے پانی میں انسیکٹس کی بھرمار تھی یا نہیں احتیاط کا تقاضا تھا کہ اس پانی سے اجتناب کیا جائے۔ سولہ روپے کی ایک بوتل جس میں بمشکل دو گلاس پانی کا آتا تھا۔

خواتین، مرد، بچے اسباب اٹھائے تفریح کی غرض سے ریوڑ کی طرح امڈے چلے آرہے تھے۔ سرائے کی تلاش میں۔ اسباب رکھ کر ادھر سے دوسرے تفریحی مقامات پر چلے جاتے۔ رات گئے واپس آتے اور اگلی صبح دوسری تفریح گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔ لوگوں کے اژدہام کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ان کے پیٹ پر پتھر تو کجا ننھی سی کنکری بھی نہ ماری گئی تھی۔ گمان ہوتا تھا کہ کئی کئی معدے ان کے شکم میں نصب کر دیئے گئے ہوں۔ من و سلویٰ اتر رہا ہو اور بے فکری سے بھرے جا رہے ہوں۔ اس فائیو سٹار ہوٹل کو اس ویرانے میں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے جنگل میں منگل ہو۔ یہاں کے وارد کسی اور سیارے کی مخلوق دکھائی پڑتے تھے۔ جن کا ہفتوں سے یہاں پڑاؤ تھا۔ ان کی شکل، لباس رنگ و روپ چمک دمک بے نیازی، بے فکری قابل دید تھی۔ تازہ واردان جو سیر گل کے لئے آئے تھے ان

سے یکسر مختلف تھے۔ انہوں نے صرف ایک مرحلہ جیتا تھا' اور داخلے کا ٹکٹ حاصل کر سکے تھے۔ اور وہ تمام مراحل طے کر کے نعمتوں سے سرفرازی کے حقدار ٹھہرے تھے۔

اس لگژری ہوٹل کے سوئمنگ پول میں مختلف لوگ نہا رہے تھے۔ عورت بچوں کو نہلا رہی تھی۔ اس کے اپنے کپڑے بھی گیلے ہو چکے تھے۔ نسبتاً" گہرے پول کے تھڑے پر انتہائی تنومند شخص بھاری بھرکم جسم پر لنگوٹ کسے صابن مل رہا تھا۔ عورت مرد اور بچوں کی جلدیں اتنی چکنی تھیں کہ اپنے شجرے کا پتہ دے رہی تھیں۔ نوٹ سنبھالتے سنبھالتے مدت کے بعد اس ملک التجار کو صابن سے یوں کھیلنے کی مہلت ملی تھی اور ٹکیہ اس کے ہاتھ سے پھسل پھسل جاتی تھی۔ بڑھے ہوئے پیٹ کے تمام حصوں پر اس کا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا چنانچہ بچوں کو چھپا چھپ پانی میں کھیلتا چھوڑ کر اب وہ عورت اس فیل شکم کی پیٹھ اور اوپر کے جسم پر صابن ملنے لگی تھی۔ دونوں کو ایک عرصے کے بعد دن کی روشنی میں ایک دوسرے کے ساتھ اتنا وقت گزارنا نصیب ہوا تھا اور وہ کسی بھی دھماکے سے بے خوف ہو کر بھرپور طریقے سے اپنے وقت کو مصرف میں لا رہے تھے۔

"آٹا مہنگا نہیں ہوا" ٹی وی پر چربی گوشت اور خون سے بھرا ہوا ایم این اے یا کوئی وزیر باتدبیر بول رہا تھا۔ " ہمارے ملک میں مہنگائی پڑوسی ملک کے مقابلے میں کم ہے' پٹرول ساری دنیا میں مہنگا ہے ہمارے ہاں سب سے کم قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ اب جو پٹرول مہنگا ہوا ہے اس کا بوجھ صاحب نصاب پر پڑے گا۔ فرنس آئل مہنگا نہیں ہوا ___ تاکہ ملک کے کارخانے بند نہ ہوں۔ بے روزگاری نہ پھیل جائے"۔

ملک کے عوام صنعتکار ہیں۔ بچارے غریب غرباء ان کی سہولت کے لئے مہنگائی نہیں کی گئی جو موٹر سائیکل رکھ سکتا ہے وہ 25 روپے لٹر میں پٹرول بھی لے سکتا ہے اور جو کار رکھ سکتا ہے خواہ وہ کار کے نام پر تہمت ہی کیوں نہ ہو وہ اتنا تو افورڈ کر سکتا ہے؟

گردن کی رگیں پھلا پھلا کر رہنمائے قوم عوام کو مہنگائی کے ہوش ربا نہ ہونے کا یقین دلا رہے تھے۔ کون سی عوام ان کی مخاطب تھی؟ وہ جو یہ پروگرام نہیں دیکھ رہی تھی اور ڈش چینلز پر گھوم رہی تھی ___ یا وہ جو گرد و پیش سے بے خبر اپنے آپ میں گم تھے اور جن کو چونکانے کے لئے شاید صور اسرافیل پھونکنے کی ضرورت تھی۔ یا وہ جو ابلاغ عامہ کی اس جدید سہولت سے ناآشنا اپنی دھن میں پیٹ پر پتھر باندھنے کی سعی کرتے تھے مگر ان کے ہاتھوں میں اب اتنا بھی دم نہ رہا تھا کہ وہ پتھر کو اٹھا کر پیٹ تک لے جا سکتے۔

دن بھر کی مزدوری کے بعد وہ اتنی رقم حاصل کر سکا تھا جس سے ضرورت بھر آٹا خرید لیتا اور اس میں نمک ڈال کر اس کی سوکھی سڑی بیوی اس کی روٹیاں تھوپ دیتی اور وہ پانی کی طرح پھیکی کالی چائے کے ساتھ اپنے چار عدد بچوں کے ہمراہ زہر مار کر لیتا۔ آٹے والے نے چکی پر آٹے کی قیمت میں فی کلو اضافہ کرنے کے بعد لکھ رکھا تھا ___ " ایٹم بم مبارک فی کلو آٹا ___ ساڑھے گیارہ روپے"

خالی پیٹ مزدوری کرنا کوئی آسان نہ تھا۔ تھکے تھکے قدم ایک جھگی کے آگے ٹھہر گئے۔ باہر ایک جھلنگا سی چارپائی پر ایک لاش پڑی تھی۔ جس کو میلا گندا سا کپڑا اس طرح ڈھانپ رہا تھا کہ اچٹتا ہوا سر اور آدھے پاؤں کے پنجے اس کی پہنچ سے باہر تھے۔ اس کی بڑی بیٹی کئی دن سے بخار اور پیٹ درد میں مبتلا تھی۔ ادویات فروشوں کی ہڑتال کی وجہ سے دکانیں بند تھیں اور اگر کھلی بھی ہوتیں تو وہ کون سا دوا خرید کر مہیا کر سکتا تھا۔ بیوی بچے خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مسلسل کم خوراک نے ان کے اندر خون کے ساتھ ساتھ آنسو بھی خشک کر دیئے تھے۔ رونے کے لئے بھی تو جان ہونی چاہئے۔

گہری اور بدبودار خامشی بڑی سفاکی سے پھیل رہی تھی۔ رات ہو چکی تھی اس کے پیٹ سے آگ نکل رہی تھی۔ بیوی گھٹنوں پر سر رکھے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بچے سناٹے کی سنگینی سے مایوس ہو کر اپنی جگہ پر نڈھال پڑے تھے۔ پیٹ کی آگ پر پانی کے چھینٹے پڑنے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ گہری تاریکی اور تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے نقاہت کا حملہ ہوا اور پھر نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

کفن دفن کے لئے بھی "سرمایہ" چاہئے تھا۔ بے مائیگی میں موت بھی کتنی مہنگی پڑتی ہے۔ لٹھا، غسال اور گورکن کی اجرت؟ قرب و جوار میں کوئی پرسان حال نہ تھا۔ غریب غرباء کے کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں ہوتے یا اگر ہوتے بھی ہیں تو بے نام و نمود ہوتے ہیں۔ پو پھٹ رہی تھی۔ اداس جھونپڑی کے ملول مکین جاگ چکے تھے اور اپنی جگہ پر پڑے پڑے کبھی آنکھیں کھول لیتے تھے اور کبھی موند لیتے تھے اردگرد نظر دوڑانے کے بعد وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

شام کے چار بجے تک وہ بمشکل دو سو روپیہ مانگ تانگ کر اکٹھے کر سکا تھا۔ قوت ارادی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ قمیص کے نیچے پیٹ پر اس نے کس کر کپڑا باندھ لیا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ گرتے گرتے بچا تو دم لینے کو بیٹھ گیا۔ یکایک اس کی ناک اشتہا آمیز خوشبو سے بھر گئی۔ کچھ فاصلے پر مارکیٹ تھی اور انگاروں پر تکے دہک رہے تھے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی پھر بیٹھ گیا __ پھر اٹھا ___ اس کی نظریں اشتہا بھری خوشبو، اپنے پیٹ اور گھر پر پڑی، نعش کے درمیان معلق ہو کر رہ گئیں۔

اگلی صبح نالے میں بہتی ہوئی نعش جھاڑی میں الجھ گئی تھی۔ نامعلوم کم سن نوجوان لڑکی کی نعش کے گرد لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ اغوا زنا کے بعد گلا گھونٹ کر مار دینے کے امکانات پر چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ موقع پر پولیس پہنچ چکی تھی اور نعش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔

نیرنگِ خیال
جامع اور وقیع ماہنامہ
مدیر: سلطان رشک
لیاقت روڈ۔ راولپنڈی

یہ فریاد نہیں کہ "تخلیق" بحران کا شکار ہے اور اپیل بھی نہیں کہ ہم ادب کی خدمت کرتے کرتے نڈھال ہو گئے' اس لئے مالی تعاون فرمایا جائے۔

امریکہ' کینیڈا اور انگلستان کے صاحبانِ ذوق اور اہلِ شوق کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ تخلیق کے حصول کے لئے محترمہ لالی چودھری سے رابطہ کریں۔ انہوں نے کمال مہربانی سے وہاں کے لئے تخلیق کی سرپرستی قبول کی ہے۔

آج کل "تخلیق" کے سال میں چھ شمارے شائع ہوتے ہیں مگر ہر شمارہ ڈیڑھ سو سے پونے دو سو صفحات کی ضخامت کا ہوتا ہے۔ ان ممالک کے لئے اس کی سالانہ قیمت تیس ڈالر یا اس کے مساوی پاؤنڈ یا دوسری کرنسی ہو سکتی ہے۔

لالی چودھری صاحبہ کا پتا ہے---

LALI CHAUDHRY
12434 MORNING AVE.
DOWNEY CA90242, U.S.A.

بھارت میں محبِ اردو اور ادب اور ادیب نواز شری کے ایل نارنگ ساقی نے یہ خدمت (بھی) اپنے ذمے لے لی ہے--- بھارت کے لئے تخلیق کی سالانہ قیمت ہے۔ مبلغ دو سو روپے صرف۔

K L. NARANG SAQI
FAIRDEAL IMPEX (Pvt.) LTD.
L-4, CONNAUGHT CIRCUS
NEW DELHI-110001

* * *

امریکا میں

پاکستان کی آواز

پاکستانیوں کا دم ساز

پاکستان لنک

انگریزی------اردو

چیف ایڈیٹر (انگریزی) فیض رحمٰن

مینجنگ ایڈیٹر (اردو) عبدالرحمٰن صدیقی

11222-LA CIENEGA BLVD SUITE-244
INGLEWOOD-CALIFORNIA-90304
U.S.A
TELE-310-337-1188 FAX-310-337-1189

کشمیری لالؔ ذاکر

(بھارت)

○

مجھ کو مرے افسانے رسوا کرتے ہیں
لوگ نہ جانیں کیا کیا سوچا کرتے ہیں

وہ شبنم ہے، پھول میں سویا رہتا ہے
ہم پتے ہیں، درد سے بکھرا کرتے ہیں

جانے والا آج تو یارو ، دیکھ لیا
آنے والے کل کی تمنا کرتے ہیں

تم بھی اپنے آپ کو دریا کر ڈالو
ہم بھی اپنے جسم کو صحرا کرتے ہیں

جانے کب ، کس آن سویرا ہو جائے
ہم تو اُفق کی سمت ہی دیکھا کرتے ہیں

○

چند لمحے تری محفل سے چُرانے ہوں گے
وہ جو مدہوش، جواں سال، سہانے ہوں گے

میں انھیں دیکھ کے آیا ہوں، تو یہ لگتا ہے
پاس ان کے مرے کچھ تازہ فسانے ہوں گے

زندگی مجھ سے خفا ہے، مرا اندازہ ہے
اور کچھ دیر ابھی ناز اٹھانے ہوں گے

میکدہ ، چاند ، چمن ، کوئی مہکتا سا بدن
ہم سے دیوانوں کے ایسے ہی ٹھکانے ہوں گے

جب نہ وہ وقت کی رونی کو کوئی ترسے گا
کیسی ہوں گی وہ رُتیں، کیسے زمانے ہوں گے

احمد ظفر

یوں تو ہر دل تھا مگر شاد مرا دل نہ ہوا
قریہ قریہ ہوا آباد مرا دل نہ ہوا

میری پلکوں پہ مہ و مہر ہیں آنسو میرے؛
اس کی بے مہری سے آزاد مرا دل نہ ہوا

کھا گئی تاج محل وقت کی یورش کتنے
آفتیں آتی ہیں برباد مرا دل نہ ہوا

وہ شکاری ہوں جو خود دام میں آجاتا ہے
صید ہے دشت میں صیاد مرا دل نہ ہوا

دائرے پھول کے ٹوٹے ہوئے دیکھے میں نے
صرصرِ وقت کی روداد مرا دل نہ ہوا

مجھ سے بڑھ کر کوئی عادی نہ ستم کا نکلا
پھر بھی کیوں مائلِ فریاد مرا دل نہ ہوا

پاؤں پڑ جاؤں ظفرؔ اس کے تو اس کو پالوں
ہیں تھا اس بات پہ گو شاد مرا دل نہ ہوا

نسیم سیفی

اِس شہرِ صلیباں میں ہر اک شخص نڈر ہے
مقتل کو سمجھتا ہے کہ یہ باپ کا گھر ہے

میں عمر کا پیمانہ سمجھ ہی نہیں پایا
لمحوں کا سفر ہے کہ یہ سانسوں کا سفر ہے

میں رونے پہ آؤں تو میں رو سکتا ہوں ہر وقت
گریہ مرے دل کا، مری آنکھوں کا ہنر ہے

حالات کے دھارے پہ بہے جاتے ہیں ہم لوگ
وہ کون ہیں حالات پہ بھی جن کا اثر ہے

کشتی کو کنارے سے لگا رکھا ہے میں نے
اور سوچ رہا ہوں یہ سفر کیسا سفر ہے

پہنچوں کہ نہ پہنچوں سرِ منزل، مری قسمت
جادہ ہے یہی میرا، یہی میری ڈگر ہے

چُپ چاپ نسیمؔ ان سے اشاروں میں کہے جا
اِس بزم میں ہر شخص کی، ہونٹوں پہ نظر ہے

مرتضیٰ برلاس

خوش مجھ سے رہے کوئی، ہو جائے خفا چاہے
لیکن یہ دلِ سادہ ہر اک کا بھلا چاہے

جو جال بچھانا ہے رستے میں بچھا ڈالو
اب جلد کوئی پنچھی ٹہنی سے اڑا چاہے

ناکردہ گناہی کے باوصف، میں حاضر ہوں
جو سب کی رضا ٹھہرے جو خلقِ خدا چاہے

بے وجہ نہیں اس کی یکدم یہ توجہ بھی
شاید وہ جفا پرور کچھ عذرِ جفا چاہے

مدھم سا اجالا ہے پھر بھی یہ غنیمت ہے
دم سادھ لو اپنا اب یہ دیپ بجھا چاہے

ہو آبلہ پا لیکن کانٹوں پہ چلے جاؤ
کچھ خون کی گلکاری اب دشتِ وفا چاہے

آ کر گلے سے لگ گیا اَن بن کے بعد بھی
بچپن نہ جا سکا ترا بچپن کے بعد بھی

اب تو ہر ایک سمت ہیں منظر ہرے بھرے
آنی ہیں کچھ رُتیں ابھی ساون کے بعد بھی

دشمن کا کوئی روپ ہو پہچانتے ہیں ہم !
چہرے وہی ہیں غازہ و روغن کے بعد بھی

پھر کوئی دوش دینا مرے ظرفِ دید کو
بینائی گر رہے ترے درشن کے بعد بھی

میں کیا کروں گا بخششِ حور و بہشت کو
جب تو نہ مل سکے مجھے جیون کے بعد بھی

بیدلؔ پانی پتی

○

چھیڑ دو کوئی بات بسم اللہ
کٹ ہی جائے گی رات بسم اللہ

جو بچھاتے ہیں راہ میں شعلے
کاٹ دو ان کے ہات بسم اللہ

جا رہے ہو تو پھر خدا حافظ
تم بھی خوشبو کے سات بسم اللہ

آؤ لے آئیں اس کی محفل سے
بٹ رہی ہے حیات بسم اللہ

آئے، اترے ہماری پلکوں پر
آنسوؤں کی برات بسم اللہ

عشق کا گیت چھیڑ کر کوئی
حسن کو دے دو مات بسم اللہ

دشت نے گر تجھے پکارا ہے
اے سمندر صفات بسم اللہ

ایک موجِ بہار آئی تھی :
لکھ گئی پات پات بسم اللہ

جانے کیا اُن کے دل میں ہے بیدلؔ
کہتے ہیں بات بات بسم اللہ

حسن اختر جلیلؔ

○

آشیانہ کوئی سونا نہیں دیکھا جاتا
مجھ سے پنجرے میں پرندہ نہیں دیکھا جاتا

بے اماں آگ کے شعلوں میں گھرے ہیں دل و جاں
بستے شہروں کا اُجڑنا نہیں دیکھا جاتا

میتیں کشتہ چراغوں کی پڑی ہیں ہر سو
بھیڑ اتنی ہے کہ رستہ نہیں دیکھا جاتا

اے وطن تیری محبت مرے احساس کا نور
مجھ سے نفرت کا یہ لاوا نہیں دیکھا جاتا

خوں میں آلودہ سحر، گرد میں لپٹی ہوئی شام
یہ اندھیرا، یہ اجالا نہیں دیکھا جاتا

آئنے میرے کبھی اتنے مکدر تو نہ تھے
حال میں چہرۂ فردا نہیں دیکھا جاتا

ذہن پر چھائے ہوئے خوف کے بادل کی قسم
اب تو یہ آگ کا دریا نہیں دیکھا جاتا

ہم نفس! بے بصروں کی تو یہ مجبوری ہے
آنکھ والوں کا بھٹکنا نہیں دیکھا جاتا

بند آنکھوں سے بھرے شہر میں رہتا ہوں جلیلؔ
مجھ سے روز اپنا جنازہ نہیں دیکھا جاتا

اکبر کاظمی

دل کی مسجد سے اٹھ رہا ہے دُھواں
دیکھ تو کون دے رہا ہے اذاں

کوئی شہرِ وفا میں رہتا ہے
دشت میں کس کا ہو رہا ہے گماں

کون آئینہ لے کے نکلا ہے :
کس کی تقدیر بن رہی ہے یہاں

پھول کس کے بہار کس کی ہے
کس کا انداز ہے گلوں کی زباں

رنگ کس کا ہے چاند تاروں میں
خاک کے ذرے ہیں فلک کی زباں

آؤ کھل کر محبتیں کر لیں :
ورنہ جینے میں لذتیں ہیں کہاں

ساری دنیا ہوئی ہے بے ترتیب
ساری دنیا ہوئی ہے نذرِ فغاں

خواب تا خواب کاظمی دیکھو
کچھ تو ہونا ہے زیست کا امکاں

ضیا علیگ
(کینیڈا)

یہ قلبِ تپاں داغِ جگر کس کے لئے ہے
اے دیدہ ورو زخمِ ہنر کس کے لئے ہے

یہ کس کے لئے آج در و بام سجے ہیں
یہ روپ محل، چاند نگر کس کے لئے ہے

وہ دَور تلک دھوپ میں جلتے ہوئے پیکر
یہ دُور تلک سایۂ در کس کے لئے ہے

کل تک تو ان کی آنکھوں میں نہ شبنم تھی نہ خوں تھا
اب آج یہ بارانِ گہر کس کے لئے ہے

یہ کون خلاؤں کی طرف آج بڑھا ہے
یہ راہ گزر، گردِ سفر کس کے لئے ہے

کس کس کا میں لوں نام جو اس دل میں بسے تھے
اب جانے یہ گمنام کھنڈر کس کے لئے ہے

ہر روز بناتا ہوں نیا ایک گھروندا
ہر روز یہی غم کہ یہ گھر کس کے لئے ہے

ہم جام میں ڈوبے تو ضیاؔ پھر نہیں اُبھرے
"یہ موج، یہ دریا، یہ بھنور کس کے لئے ہے

رشید قیصرانی

چلو کہ چل کے یہ قصہ تمام کر آئیں
دلوں کی دھڑکنیں سب ان کے نام کر آئیں

چلو کہ چاند کرن کو سلام کر آئیں
جبینِ شوق کو عالی مقام کر آئیں

چلو نگاہِ کرم کی کرامتیں دیکھیں
چلو بہشت میں اِک شب قیام کر آئیں

چلو کہ لفظ کا جوہر کہیں تلاش کریں
چلو کہ جانِ سخن سے کلام کر آئیں

چلو کہ آج کسی نور نازنیں کے سپرد
جہانِ دید کا سارا نظام کر آئیں

چلو کہ رقص کریں آج کوئے یار میں ہم
محبتوں کا چلن پھر سے عام کر آئیں

چلو کہ راہِ طلب میں گنوا کے جان اپنی
وصالِ یار کا کچھ اہتمام کر آئیں

حسین شاہد

مرے دل میں اتر آیا ہمہ رنگ کارواں تیرا
بدن آرام جاں تیرا، سراپا کہکشاں تیرا

ان آنکھوں میں رُکا ہے اس طرح منظر بچھڑنے کا
کہ ہر منہ موڑنے والے پہ ہوتا ہے گماں تیرا

جنم میرا ہوا رہنِ سفر دونوں کی شرکت سے
جبینِ مضطرب میری، گریزاں آستاں تیرا

سزائے بے خطا بھی سہ گئے جیسے کہ نعمت تھی
عطائے درد کو بھی ہم نے جانا ارمغاں تیرا

جو کل میخانے سے نکلے تو کیسی آن سے نکلے
گلی اپنی میں ہم ڈھونڈا کئے، اڑیے! مکاں تیرا

رہا تیکھے سوالوں کا ہمیشہ سامنا ہم کو!
نہیں آنے دیا پر نام ہم نے درمیاں تیرا

بہت تڑپے انا تیری اور اپنی وضعداری پر
سنا جب کام بگڑا ہے، نصیبِ دشمناں تیرا

ترے انکار کی اگنی میں گو دن رات جلتا ہے
دعا ارسال کرتا ہے، رہے شاہد جہاں تیرا

کرشن کمار طور
(بھارت)

لاہور کے نام ـــــ کچھ غزلیں

(۱)

کیا بولیں کیا وقعت رکھتا ہے اپنا لاہور
تپتی ریت کا صحرا ہم ہیں اور دریا لاہور

دونوں کے ہے وصل کا نقطہ میری خاک خمیر
اِک رستا جاتا ہے دل کو اِک رستا لاہور

اک ہے نظام پیا کا مرقد اک داتا دربار
ثمر ثبوت ہیں یکساں اب کیا دلی کیا لاہور

چاروں طرف سے خوشبو خزانہ یادوں نے کھول دیا
جب چومی اس نقش کی مٹی جب دیکھا لاہور

ہے تو کہاوت یہ لیکن کتنی سچی سچی
طور وہ پیدا نہیں ہوا جس نے نہ دیکھا لاہور

(۲)

کیسا رہا لاہور
پھولوں بھرا لاہور

گہرا ہے دل دریا
موتی مرا لاہور

میرا جنوں مرقد
اچھا بُرا لاہور

جب سے ہوا ہوں دُور
مجھ سے چھُپا لاہور

ہے عشق پر اب ثبت
نقشِ وفا لاہور

چمکا کہیں جگنو
یاد آگیا لاہور

اس کا اگر ہوں طور
میرا سدا لاہور

(۳)

خوشبو خواب خمار لاہور
شامل شاہ شمار لاہور

رستہ رنگ روانہ رفتہ
سورج سرد ستار لاہور

گل گلنار گلاب گردش
چہرہ مست چنار لاہور

بستی باب بہار بستہ
کشتی کاخ کنار لاہور

منگل مشک منار مصرع
گزراں گرد گزار لاہور

طرفہ طور طراز طولیٰ
اکرم اشک انار لاہور

(۴)

نامی ناموں کا گل دستہ لاہور
علمی کتابوں کا اِک بستہ لاہور

قائم دائم اس سے منزلِ مقصود
خیر مقام ہو جو وہ رستہ لاہور

پلک پلک چنی ہوئی ہیں تصویریں
مشکِ منور سے صف بستہ لاہور

سرسبز کمال جمال رہے ہر دل
خدا کرے کبھی نہ ہو خستہ لاہور

کھلے تو اللہ ہو کی سرگم میں گُم
اِک ایسا رازِ سربستہ لاہور

اس کی خوشبو خاک سے ہے طور ظہور
میری رگ رگ سے پیوستہ لاہور

عبدالعلی شوکت

خشمگیں خشمگیں مرے احباب
کچھ ہیں بے خواب، کچھ پریشاں خواب

بات بنتی نہیں زمانے میں
ہے خدا ہی مسبّبُ الاسباب

مختلف سانحاتِ دیدِ جمال
کوئی خاموش ہے کوئی بے تاب

چاہتیں، عزّتیں، سکوں، آرام
کُھل گئے آرزو کے کتنے باب

ہم کو عصبیّتوں نے گھیرا ہے
زندگی ہو گئی ہے کیوں زہراب

ہر طرف تُو تکار ہے شوکتؔ
ایک اُمّت بنی کئی احزاب

جگر جالندھری
(بھارت)

کس زور کی کشش تھی تری جلوہ گاہ میں
دیوانے کو نہ روک سکا کوئی راہ میں

اپنی نظر کو کیوں نہ بہشتِ نظر کہوں :
ہر وقت آپ رہتے ہیں میری نگاہ میں

جلتا ہے پیڑ دھوپ میں سائے کے واسطے
آساں نہیں ہے رکھنا کسی کو پناہ میں

چلنے کے واسطے ہیں کئی راستے ، مگر :
ہوتا ہے ختم سب کا سفر تیری راہ میں

دل کو بھی تُو پسند ، نظر کو بھی تُو پسند !
ہم تجھ کو دل میں رکھیں کہ رکھیں نگاہ میں

یارب : اگر کسی کا بھلا ہو گناہ سے
کیا وہ بھی لکھنا چاہیئے فردِ گناہ میں

اک روز جانے والا پلٹ کر بھی آئے گا
کب سے اس آس پر کوئی بیٹھا ہے راہ میں

اے دوست ! ترے جلووں کو پہچانتے ہیں ہم
اتنی تجلّیاں ہیں کہاں مہر و ماہ میں

سورج بنے ستارے بنے چندرماں بنے
جتنے بجُھے چراغ محبّت کی راہ میں !

وقت اپنا زندگانی کی محفل میں اے جگرؔ
گزرا کچھ آہ آہ میں، کچھ واہ واہ میں !

خان پرویز
(لندن)

اب کے موسم، یہ حال میرا ہے
دوستوں، دشمنوں نے گھیرا ہے

حق مرا بھی تو کچھ وطن پر ہے
گرچہ پردیس میں بسیرا ہے

لب کی سُرخی تری، نہیں شامل
کون کہتا ہے یہ سویرا ہے

آسکیں پھر نہ لوٹ کر شاید
جوگیوں والا اپنا پھیرا ہے

بیوفا یار ہے یہ "ساوا" نوٹ
یہ نہ تیرا ہے اور نہ میرا ہے

اس میں ہریالی سبز گنبد کی!
سوہنی دھرتی کا یہ پھریرا ہے

رب کی نظروں میں سب برابر ہیں
میں ہوں "کاماں" نہ تو "وڈیرا" ہے

تیرے چہرے کی روشنی کی قسم
میرے جگ میں بڑا اندھیرا ہے

میں ہوں پرویز میکدے کا امام
ساقیٔ خوبرو لٹیرا ہے!

کنول فیروز

رہا ہی کیا ہے مرے پاس اب بتانے کو
ہر ایک چیز کو کھویا ہے اُس کو پانے کو

وہ سانحہ جو محبت کے نام پر گزرا!
تمام عمر لگے گی اُسے بھلانے کو!

وہ ہم تھے پیار سے مارا، تو مر گئے ہم لوگ
وگرنہ ہم سا ملے گا کہاں زمانے کو

وہ میرا دوست تھا غیروں کا ہو گیا تو کیا
کہا تھا کس نے اُسے رازداں بنانے کو

تو چاندنی ہے تو خوشبو ہے شاعری ہے تُو
کلی کا کِھلنا کہا تیرے مُسکرانے کو

حضور آپ کی زلفوں کے سائے سائے تلے
چھپائے پھرتی ہیں آنکھیں شراب خانے کو

اُسی کے نام سے منسوب کر دیا ہے کنولؔ
کوئی تو نام بھی دینا تھا آشیانے کو

ابراہیم اشک
(بھارت)

بُوئے احساسِ چمن، اور تخلیق
صبح کی پہلی کرن، اور تخلیق

ڈوب جائیں تو اُبھرنا آئے
موجِ طوفاں کا چلن، اور تخلیق

آپ ہوتے نہیں معنی پیدا
جان مانگے ہے لگن، اور تخلیق

رقص فرما ہے تخیّل بر دوش
فکرِ نیرنگ بدن، اور تخلیق

مجھ کو دنیا سے بھلا کیا لینا!
میں ہوں بیداریٔ فن، اور تخلیق

رفعتِ فکر و معانی مانگے
اشکؔ معراجِ سخن، اور تخلیق

اب کوئی شاخ ہے نہ شجر، دشتِ شوق ہے
میں برگِ بے نوا ہوں، سفر دشت شوق ہے

پھرتا ہوں حسبِ گردشِ پیمانہ چار سُو!
ہمراہ شمس ہے نہ قمر، دشتِ شوق ہے

اِک مملکت ہے میرے تخیّل کی جس جگہ
ہے شہرِ علم، شہرِ ہنر، دشتِ شوق ہے

وسعت گہہِ خیال نہیں ہے حدود میں
جاتی ہے جس طرف بھی نظر دشتِ شوق ہے

اے موجِ گردِ راہ مری ہم سفر ہے تُو!
تجھ کو بھی کیا عزیز مگر دشتِ شوق ہے

راس آئی اشک کاوشِ فکرِ سخن مجھے!
میرے لئے ہے حرفِ گُہر، دشتِ شوق ہے

ناصر زیدی

ہم دلِ مضطر کو سمجھانے لگے
پھر فریبِ آگہی کھانے لگے

اُس قدر ہی دوریاں بڑھتی گئیں
جس قدر نزدیک وہ آنے لگے

برف کی چادر بھلا کس کام کی
آسماں جب آگ برسانے لگے

میں ہمہ تن گوش ہوں فرمایئے
آپ کچھ ارشاد فرمانے لگے

اب جفائیں مستقل ہونے لگیں
ہم وفاؤں کا صِلہ پانے لگے

مِلنا جلنا چھوڑ بیٹھے وہ، مگر
خواب میں آ آ کے تڑپانے لگے

استخارا دیکھ کر ہم اِن دنوں
گتھیاں قسمت کی سلجھانے لگے

پھر ہوئے وہ مجھ سے محوِ گفتگو
شہد سا کانوں میں ٹپکانے لگے

کیا ہوا ناصر تمہیں، تم رات دن
گیت اُلفت کے بہت گانے لگے

اُس نے کہا کہ میرا دل آپ سے آج بھر گیا
سُن کے یہ دل نشیں سخن، میں تو وہیں پہ مر گیا

وہ بھی تھے دن کہ حلقۂ ماہ وَشاں تھا اور مَیں
یہ بھی ہے کوئی زندگی، شام ہوئی تو گھر گیا

سبزہ و گل کے درمیاں، رونقِ بزمِ گلستاں
وہ جو رہا چمن چمن، رنگِ چمن نکھر گیا

چاروں طرف سے تھا ہجوم، یورشِ غم کا دوستو
میں ہی تھا جو ڈٹا رہا کس نے کہا کہ ڈر گیا؟

غلبۂ حسن میں رہا، جذبِ جنوں بھی بر ملا
وقتِ گریزِ پا کی خیر، دَور تھا اک گزر گیا

میرے خراب حال پہ طاری تھی اک فسردگی
آپ کے التفات سے حال مرا سنور گیا

ناصرِ خوش نوا ترا طرزِ کلام ہے الگ!
جو بھی غزل کہی کبھی، شعر نگر نگر گیا

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

گلشن کا حُسن پھول کا شعلہ سفر میں ہے
ہر سمت اِک بہارِ سراپا سفر میں ہے

سورج کی گردشوں سے ہے گردش میں روشنی
سایا مقیم نور کا دھارا سفر میں ہے

اے کاروانِ شوق تو رہبر سے درگزر
دل ساتھ ہے خیال کی دُنیا سفر میں ہے

سوچو تو ذرّے ذرّے کو منزل کی ہے تلاش
دیکھو تو اِک جہانِ تمنّا سفر میں ہے

تاریکیوں پہ ڈال دی کس نے کمندِ نُور
کس کے جمال سے شبِ یلدا سفر میں ہے

آنکھوں سے گر رہی ہے شراروں کی آبشار
کہسارِ دل میں آگ کا دریا سفر میں ہے

اللہ رے کمالِ محبّت کی کیفیّت !
میں نے وفورِ شوق کو دیکھا۔ سفر میں ہے

کس کے رُخِ جمیل کی تابش کے فیض سے
تاروں کا نُور چاند کا جلوہ سفر میں ہے

مہتاب، زندگی کا ازل سے سفر میں تھا
اب بھی حیات کا رُخِ سیما سفر میں ہے

سوزِ جگر، بہارِ نظر سیلِ اشکِ غم
جاناں تری تلاش میں کیا کیا سفر میں ہے

شامِ غمِ فراق کا منظر عجیب تھا
اب تک متاعِ صبحِ تماشا سفر میں ہے

اے اہلِ قافلہ نہ بڑھاؤ حضر کی بات
یہ تو پڑاؤ ہے ابھی بندہ سفر میں ہے

صحرائے دل میں پھر ہوئی بانگِ درا کی گونج
سبطین کوئی صورتِ لیلیٰ[1] سفر میں ہے

[1] لیلیٰ

عارفؔ ہوشیار پوری
(سویڈن)

○

اے عزم! مرے دل کو وہ توفیقِ خضر دے
جو ہارے ہوئے دل کو نیا ذوقِ سفر دے

اے عشق! مری آنکھ کو وہ برق و شرر دے
میں پھونک دوں سب اپنے گرائے ہوئے پردے

میں عام گدا گر نہیں کاسہ مرا بھر دے
یہ چھوڑ دیا تجھ پہ مجھے خیر کہ شر دے

راحت کی طلب نے مجھے بکھرا دیا یکسر
اس ذرہ کا طالب ہوں جو یکجا مجھے کر دے

یا چھین لے تو مجھ سے مری خواہشِ پرواز
یا پھر مری اس خواہشِ پرواز کو پر دے

میں اور یہ محدود نگاہی مرے مولا!
تو میرے تجسس کو نئے شمس و قمر دے

ہم کو وہ کڑکتی ہوئی بجلی بھی مبارک!
صحرا کو جو آتے ہوئے بادل کی خبر دے

جب اس رُخِ انور سے نقاب اُٹھ گئی سہواً
عارفؔ کی نگاہوں پہ گرے اور بھی پردے

سردار پنچھیؔ
(بھارت)

○

جب تلک روح و بدن کی تشنگی مرتی نہیں
ساگروں سے بادلوں کی دوستی مرتی نہیں

بحر سے بادل کا چلنا پربتوں سے لوٹنا
جب تلک یہ کھیل ہے کوئی ندی مرتی نہیں

جلتے جلتے سو بھی جائے ایک پل دیپک تو کیا
بانٹ دی جو عمر بھر وہ روشنی مرتی نہیں

پھول کا کھلنا مقدر ہے تو مرجھانا بھی ہے
پتی پتی ہو کے بھی خوشبو کبھی مرتی نہیں

جس میں کوئی اہلِ فن اہلِ قلم پیدا ہوا
ساری صدیاں مر بھی جائیں وہ صدی مرتی نہیں

ایک پردے ہی کے پیچھے جسم چھپ جاتا ہے بس
موت بھی آتی ہے لیکن زندگی مرتی نہیں

(حکیم سعید کے لیے)

ایس اے فہیم
(بھارت)

سرِ مژگاں نہ اگر جلتے ستاروں کے چراغ
پھر کہاں ملتا شبِ غم مجھے منزل کا سراغ

جن سے روشن ہیں تری بزمِ محبت کے چراغ
کیا قیامت ہے اٹھاتے ہیں وہی داغ پہ داغ

جن کو ہمت کی ہے توفیق وہ پی سکتے ہیں
دستِ امروز سے نے کرمِ فردا کا ایاغ

سرد آہوں سے ہوئے ہیں نہ لپکتے شعلے!
گرم سانسوں نے جلائے نہ کبھی کوئی چراغ

میرے خوابوں کو نئے دور کی تعبیر نہ دو!
دل کے ہمراہ نہ ہو جائیں پریشاں دماغ

اپنے دامن کی ہواؤں کو ذرا روک تو لو
آندھیوں نے تو جلائے یہ بجھا دیں گے چراغ

شورشِ رقصِ جنوں سے ہی یہ معلوم ہوا
خود گرفتارِ بلا کم نہیں دنیا میں دماغ

راہرو اس شبِ تاریک سے مایوس نہ ہوں
راہ دکھلائیں گے جلتے ہوئے داغوں کے چراغ

جادۂ عزم و عمل پر یہ رہے یاد فہیم!
قوتِ فکر و نظر دیتی ہے منزل کا سراغ

یاسمین صہبا

بہاروں نے بخشا گلابوں کا موسم
لئے گل بداماں شبابوں کا موسم

ہر اک شاخ پر خوب سے خوب تر ہے
کہیں چھپ گیا ہے خرابوں کا موسم

کسی خوب صورت کی رنگت چرا کر
زمیں پر ہے اترا گلابوں کا موسم

لئے ہر طرف جستجو کی تمنا
سوالوں کا موسم جوابوں کا موسم

فضا لکھ رہی ہے گلوں کے فسانے
ہے بازارِ دل پر کتابوں کا موسم

ذرا تم بھی آ کر سمیٹو تو اس کو
چمن میں ہے صہبا ثوابوں کا موسم

ماہ طلعت زاہدی

دل میں اس کا خیال رہتا ہے
یہ غمِ لازوال رہتا ہے

فکرِ فردا میں گم ہوں میں، جب کہ
رنجِ ماضی و حال رہتا ہے

سر ہے سجدے میں دل حضوری میں
اور ذکرِ ملال رہتا ہے :

عاجزی نے ہمیں مٹا ڈالا
اُس کا جاہ و جلال رہتا ہے

کس سے دل کی زباں میں بات کروں
کیا کوئی باکمال رہتا ہے

داغِ دل کس کو جا کے دکھلاؤں
یہ انوکھا سوال رہتا ہے !

نیند آتی نہیں ہے دل میرا
وسوسوں سے نڈھال رہتا ہے

اُس کے سائے میں خوش رہی تھی بہت
قرضۂ ماہ و سال رہتا ہے

جانے والے تو جا چکے کب کے
قصۂ عرضِ حال رہتا ہے

رات دن بہتے رہتے ہیں آنسو
رات دن ایک حال رہتا ہے

جانے کتنے زمانے بیت گئے !
جانے کب تک یہ حال رہتا ہے

نامی انصاری
(بھارت)

حسنِ تمام کہتے ہیں، مشعلِ جاں سمجھتے ہیں
حیلہ گرانِ شہر کو لوگ کہاں سمجھتے ہیں !

جرعہ کشانِ وقت کو جامِ سخن سے کیا غرض
یہ تو فقط حکایتِ سود و زیاں سمجھتے ہیں

وجہِ ستم کچھ اور ہے، ورنہ انہیں ہے سب خبر
نالۂ درد سنتے ہیں، نوحۂ جاں سمجھتے ہیں

دشتِ جنوں میں، دور تک جانے کا حوصلہ نہیں
حیلۂ پائے نارسا، ہم بھی میاں سمجھتے ہیں

خود کو فریب دینے میں اہلِ نظر بھی کم نہیں
وصفِ سراب لکھتے ہیں، آبِ رواں سمجھتے ہیں

کعبۂ دل تھا منسلک، حسن کے سومنات سے
کس نے کسے مٹا دیا، دیدہ وراں سمجھتے ہیں

نامی کسی پہ ہو نہ ہو، حرفِ سوال آشکار
عشوہ گرانِ خاص تو نامۂ جاں سمجھتے ہیں

صبیحہ صبا

جان گئے تو مان لیا
یوں تجھ کو پہچان لیا

دنیا بھیدوں والی نے
کیسا پردہ تان لیا

دل والوں کی بستی سے
تُو نے کیا سامان لیا

مشکل سے حل ہوتا ہے
قصّہ جو آسان لیا

کیا مانیں ہم دل کی بات
دل بھی تو نادان لیا

منزل پھر بھی دور رہی
صحراؤں کو چھان لیا

میٹھے میٹھے بولوں کا
دل نے کیسا دان لیا

صفدر صدیق رضی

آنکھوں میں ہے اب تک وہی زیبائشِ دُنیا
رکھا نہ کہیں کا مجھے اے خواہشِ دنیا

اچھا ہے کہ جلتے ہو خود اپنی ہی تپش میں
تم تک ابھی پہنچی ہی نہیں آتشِ دنیا

چشم و لب و عارض میں ہیں اندیشۂ صد رنگ
جس دم وہ کھُلا ہم پہ کھُلی سازشِ دنیا

دنیا میں ترے حُسنِ دل آرا کی بدولت
پھیلی ہے بہت دُور تک آرائشِ دنیا

وسعت میں ہمیشہ سے جداگانہ ہیں دونوں
دُنیا میں نہیں دل میں ہے گنجائشِ دنیا

اے جذبۂ پندار قدم بوس نہ ہونا !
یادوں سے لپٹ جائے گی آلائشِ دنیا

دُنیا کو کیا ترک جب اس کے لئے ہم نے
تب اُس نے رضیؔ ہم سے کی فرمائشِ دُنیا

سجاد مرزا

صحنِ گلزار سے کیا بادِ بہاری نکلی
شہرِ احساس میں خوشبو کی سواری نکلی

ملک در ملک پھرا دل نہ کہیں پر بھی لگا
سب زمینوں سے زمیں دیس کی پیاری نکلی

حاکمِ شہر ترا نام بھی بدنام نہ ہو
قاتلوں سے جو تری سلسلہ داری نکلی

شاہ اور اس کے مصاحب بھی ہوئے قتل تمام
شاہ کی فوج تو دشمن کی حواری نکلی

قصرِ شاہی کی ہر اک اینٹ ہے گروی یعنی
صاحبِ تخت کی اولاد بھکاری نکلی

سب کو معلوم ہے پانی ہے وہاں زہر آلود
پھر بھی پنگھٹ کی طرف کون کنواری نکلی

پاسباں سو گئے اس رات کو سارے شاید
جب محلات سے اک راج کماری نکلی

اپنی کٹیا میں شب و روز بلانے والی
کیوں چمکتے ہوئے سکوں کی پجاری نکلی

ایسا لشکر بھی نہ تھا میرے مقابل سجاد
فوج میری ہی مگر حوصلہ ہاری نکلی

رب نواز مائل

اس سے ملنے کو دل مچلتا ہے
جس سے کیا ساتھ کو نکلتا ہے

اس فضائے کثیر ساماں میں
دیکھیں کس طور فقر پلتا ہے

لوگ آتے ہیں یا کہ جاتے ہیں
کاروبارِ حیات چلتا ہے

چاہے کتنا بھی زور مارے کوئی
ہونی کا کس سے کچھ بھی ٹلتا ہے

ہم سے کیا کچھ نہیں تغیر کا
دیکھنا ہے کہ کیا بدلتا ہے

جو مُصر ہو کے ہونے پر مائل
اس سے بھی ہونا ہی نکلتا ہے

محمد اسلم

کوچۂ جاں کو کیوں مقتل کہیے
جان سوزی ہی سہی، ستم کر سہیے

تم نے دیکھا تو ملامت کی دل نے
درماندہ سہی دنیا کو تبھی کیوں کہیے

میں نے مانا کہ مقدر میں نہیں سیرابی
میں کہ صحرا ہوں، ذرا تھم کر چلیے

میں نے دیکھا ہے غزالوں کو مگر فاصلے سے
پاس آئے ہو تو پل بھر رہیے!

سینچیے خون سے جگر گوشوں کو
ہاں مگر عیب بڑھاپے پہ رہے رہیے

میں سمجھتا ہوں غنا کے معنی اسلم
اپنے دامن کو سمیٹے ہی رہیے

انیلہ خان

تصورات کا حسن و جمال کافی ہے
ہمارے دل کو تمہارا خیال کافی ہے

خیال تھا کہ ترا ساتھ کچھ ضروری نہیں
مگر کھلا ہے کہ جینا محال کافی ہے

بھلا چکے ہیں بظاہر تجھے مگر ہمدم
دل شکستہ کو اب تک ملال کافی ہے

کچھ اور تجھ کو بتاؤں سکت نہیں مجھ میں
جو کہہ دیا ہے نگاہوں نے حال کافی ہے

تجھے میں سوچوں تخیل میں اور سو جاؤں
اب اس طرح کا بھی مجھ کو وصال کافی ہے

تجھے تو آنے کی فرصت ہی اب نہیں ملتی
اور انتظار میں اپنا کمال کافی ہے

فریب ایسے دیئے تو نے دلفریب کہ اب
ہر اک فریب کہ تیری مثال کافی ہے

اب اور جور و جفا مجھ پہ کر نہ تو ظالم
جو ہو چکا ہے وفا کا زوال کافی ہے

سمجھ سکے تو اگر میری آرزو کیا ہے
تو میری ذات کا اک یہ سوال کافی ہے

انیلہ کر نہ کوئی غم کہ وہ ستاتا ہے
تری مدد کو ترا ذوالجلال کافی ہے

صفیہ راگ
(بھارت)

ویرانے میں یہ دیپک جل کر اداس ہو گا
دل بھی ہمارا یونہی اکثر اداس ہو گا

جب جب رہے گی کوئی تصویر نامکمل
رنگوں کے درمیاں بھی منظر اداس ہو گا!

پھر ختم سلسلہ بھی یہ جستجو کا ہو گا!
مل بھی گئی جو منزل رہبر اداس ہو گا!

یہ خونِ بے گنہ بھی بہہ کر جو چُپ رہے گا
قاتل کے ہاتھ میں پھر خنجر اداس ہو گا

آنگن کھُلا ہی رکھنا یہ گھر کا ہے تقاضا
دیوار مت اٹھانا یہ گھر اداس ہو گا

حرفِ وفا کے معنی تم نے غلط جو سمجھے
وہ راگ جب ملے گا مل کر اداس ہو گا

خالد جاوید جان

یہ جو ہے پہلا ستارا شام کا
اس کی جانب ہے اشارا شام کا

اس کی آنکھیں ہیں حوالہ صبح کا
اس کا کاجل، استعارا شام کا

دن تو جیسے تیسے کر کے کٹ گیا
کس طرح ہو گا گزارا شام کا

چار سُو پھیلا لہو خورشید کا
دن نے یوں صدقہ اتارا شام کا

اس کے پہلو میں غروبِ آفتاب
پھر دکھا دے وہ نظارا شام کا

شام کو اکثر پریمی ملتے ہیں
نام کوئی رکھ دو پیارا شام کا

یادوں کا میلہ سجا لیتا ہوں جانؔ
اب ہے یہ باقی سہارا شام کا

ریاض الحق ریاضؔ

جب اُس نے پہلا قدم ہی شباب میں رکھا
چھُپا کے آئینہ اپنی کتاب میں رکھا

وہ ملتفت بھی رہا مجھ پہ اور گریزاں بھی
خیال قُرب کا یوں اجتناب میں رکھا

ہے احتیاط میں وہ اتنا پسند اتنا
تکلفات کو طرزِ خطاب میں رکھا

ہر اک چیز مجھے صاف پھر نظر آئی
جب اپنے دل کو بھی آنکھوں کے باب میں رکھا

تھی دیدنی مری تعبیر خواب کی صورت
جب اک ستارے کو چشمِ بے آب میں رکھا

وہ حرفِ غم کہ عبارت ہے زندگی جس سے
وہ حرفِ غم اِسی دل کے نصاب میں رکھا

حقیقتوں کا ہی منظر دکھانا تھا مقصود
تو رنگِ آبِ رواں کیوں سراب میں رکھا

چراغ اپنے بجُھاتی رہیں مری آنکھیں
مگر یہ دل کا نگیں آب و تاب میں رکھا

خمیر آب و ہوا سے اٹھایا پہلے ریاضؔ
پھر ایک شعلۂ ہستی حباب میں رکھا

ملک زادہ جاوید

(بھارت)

یقیناً وہ مرے معیار کا ہے
اسے بھی ڈر صلیب و دار کا ہے

نظر آتا ہے رگ رگ میں شجر کی
یہ موسم کچھ عجب کردار کا ہے

مخالف سارے عالیجاہ کے ہیں
مگر لہجہ ابھی دربار کا ہے

ہیں جس تہذیب کے مارے ہوئے ہم
یہ پتھر تو اُسی آثار کا ہے

زباں ہر قوم کی ہوتی ہے پھر بھی
یہ موضوع آج کل تکرار کا ہے

محمد افضل ہزاروی

پرانے سب نظارے جا رہے ہیں
نئے منظر ابھارے جا رہے ہیں

اُدھر ہے سرد مہری اور ادھر سے
اشارے پر اشارے جا رہے ہیں

سفینہ ہو رہا ہے غرقِ طوفاں
نگاہوں سے کنارے جا رہے ہیں

شبِ غم میں رُخِ روشن کے جلوے
اندھیروں کو نکھارے جا رہے ہیں

نہیں باطل پہ اب کوئی توجہ
فقط ظاہر سنوارے جا رہے ہیں

کہیں الجھی پڑی ہے زلف افضلؔ
کہیں گیسو سنوارے جا رہے ہیں

عثمان قیصر

خلوص، پیار، محبّت وطن میں عام کرو!
کسی کا دل نہ دُکھی ہو سدا وہ کام کرو

عدو بنو نہ کبھی ترک انتقام کرو
فساد و جبر کا قصّہ یہیں تمام کرو

حصولِ رزق میں محنت بھی اِک عبادت ہے
مگر ہے شرط دیانت کا اہتمام کرو

چھری کے زخم سے گہرا ہے زخم باتوں کا
ذرا سنبھل کے تم اپنوں سے بھی کلام کرو

بدل ہی جاتے ہیں حُسنِ سلوک سے تیور
عدو بھی آئے اگر سامنے سلام کرو

ہزاروں لال تہہ تیغ ہوئے ہیں ماؤں کے
نہ اب خدا کے لئے تیغ بے نیام کرو

درندے شہر کی گلیوں میں دندناتے ہیں
لہو بکھرنے سے پہلے انہیں لگام کرو

ستارے اشک کے مژگاں پہ جگمگانے دو
چراغ کوئی بھی روشن نہ وقتِ شام کرو

غمِ حیات کی اب تلخیوں کو سہنا ہے
سکونِ قلب کو تم سجدہ و قیام کرو

لو چل چلاؤ کا لمحہ بھی پاس آ پہنچا
عزیزو اب مری رخصت کا انتظام کرو

سببِ زوال کا قیصرؔ یہی نہ بن جائے
جدید دور میں فرسودگی نہ عام کرو

محمد جوادؔ حسن

○

کشورِ آہ، نہ اقلیم اثر چاہتی ہے !!
روحِ بے تاب توجہ کی نظر چاہتی ہے !

کچھ اداس ایسی ہوئی خاطرِ ناشاد اب کے
خواہشِ گریہ ہے نے دیدۂ تر چاہتی ہے

چشمِ یک رنگیٔ نظارہ سے اکتا سی گئی
تیرے کوچے کے سوا اور نگر چاہتی ہے

ایسی مانوس ہوئی تجھ سے طبیعت میری
چھوڑ کر سارا زمانہ، ترا در چاہتی ہے

تم سنو گر تو یہ کھل جائے سخن ہے کیا چیز
اہلِ محفل ! یہ زباں عرضِ ہنر چاہتی ہے

میں بھلا ہوں اسی حالت میں بڑھا اپنی دکل
چارہ سازی تو تری اب مرا سر چاہتی ہے

ایسی وحشت ہے کہ دل ڈھونڈتا پھرتا ہے پناہ
تابِ نظارہ نہیں، آنکھ مفر چاہتی ہے

سیماؔ سراج

○

ہر اک آنکھ اشکوں سے تر دیکھتی ہوں
نہیں دیکھا جاتا مگر دیکھتی ہوں

اٹھاتی ہوں جس سمت بھی میں نظر
خود اپنا ہی زخمِ جگر دیکھتی ہوں

شبِ وصل کی آہٹیں جن میں پاؤں
کہاں اب وہ شام و سحر دیکھتی ہوں

ہوئے ریزہ ریزہ خیالی گھروندے
عجب دہشتیں ہیں جدھر دیکھتی ہوں

بہار اب کہاں میری قسمت میں سیماؔ
خزاں ہوں خزاں کا اثر دیکھتی ہوں

روبلینہ تحسین

کیا پایا تیری باتوں سے !
بس دھوپ ملی برساتوں سے !

میں کس سے کہوں کس نے لُوٹی
مہندی کی سُرخی ہاتھوں سے

یہ اُجڑے لفظوں کی کویتا
باتیں ہیں اپنی ذاتوں سے

لندن میں رہ کر عشق کیا
لاہوروں سے گجراتوں سے

میں آئی شہر کراچی میں
سرسوں چُنتی دیہاتوں سے

تحسین تو پاگل لڑکی ہے
درگزرو اِس کی باتوں سے

مشتاق احمد

تماشا بھی وہی ہے اور تماشاگر نہیں بدلا
فقط کردار بدلے ہیں ابھی منظر نہیں بدلا

وہی ہے جبر تیرا آج بھی اے روحِ سلطانی
تری ہیئت تو بدلی ہے ترا جوہر نہیں بدلا

تباہی سے یہ بستی بچ نہیں سکتی کسی صورت
ہے جو غارت گرِ جاں درد کا لشکر نہیں بدلا

مجھے تجھ سے عدالت کی توقع ہو نہیں سکتی
مرے منصف ! تیرا معیارِ خیر و شر نہیں بدلا

مجھے تسلیم ہے حالات نے بدلا ہے مجھ کو بھی
مگر اے جانِ جاں میں تم سے تو بڑھکر نہیں بدلا

لال سنگھ

سید ضمیر جعفری

قدرت نے مجھے دوستوں، مداحوں اور کرم فرماؤں کی نعمت سے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم میں ہمیں قدرت نے ایک عاشق بھی عطا کر دیا اور ہمیں "معشوقی" کی عشرت بھی میسر رہی۔ یہ زندگی میں ہمارا پہلا اور ظاہر ہے کہ آخری تجربہ ہے کہ ۔

آخری عمر میں، کیا خاک مسلماں ہوں گے

ہمارا "عاشق" لال سنگھ سکول کے گیٹ (Gate) کے سامنے "آلو چھولے" کا خوانچہ لگاتا تھا۔ اس کی پیدائشی عمر تو یہی کوئی پچیس برس کے لگ بھگ ہوگی مگر نمائشی عمر چالیس سے اوپر لگتی تھی۔ مونچھ اور داڑھی میں اتنا گمبھیر الجھاؤ تھا کہ مونچھ داڑھی میں اور داڑھی مونچھ میں چلی گئی تھی۔ کپڑے اس کے چکٹ میلے ہوتے اور ڈھیلی ڈھالی پگڑی کے آدھے پیچ اس کے گلے میں پڑے رہتے۔ ایک آنکھ سے "ٹیرے" یعنی "کانے" بھی تھے۔ جسم کے بیرونی "مقامات" میں کوئی علاقہ ایسا نہ تھا کہ جس پر نگاہ ٹھہر سکے۔ قدرت کی اس غلط بخشی پر حیرت بھی ہوئی کہ ۔

غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

لیکن قدرت کسی انسان کو خوبیوں سے نبٹ کورا بھی نہیں رکھتی۔ اس اجڈ، کھردرے، بے پڑھے، ان گھڑے، ژولیدہ صورت سکھ کی زبان بڑی میٹھی تھی۔ اس کے "آلو چھولے" بھی جو پنجابی میں "چکڑ" یعنی کیچڑ چھولے" کہلاتے اس قدر خوش مزہ تھے کہ بعد میں چاندنی چوک، دہلی اور گوال منڈی لاہور کے "چھولا پہلوانوں" کے چھولے بھی ہماری زبان کو وہ ذائقہ نہ دے سکے۔ بچپن کی دوسری حسیات اور تجربات کی طرح بچپن کے ذائقے بھی ساری عمر آدمی کے خون میں دوڑتے رہتے ہیں۔

آدھی چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی لڑکے لال سنگھ پر ٹوٹ پڑتے۔ پیپل کے پتوں کا "دونا" ایک آنے میں ملتا۔ کلچہ ساتھ کھاؤ تو ایک آنہ اور دو۔ زیادہ لڑکے ایک آنے والے ہوتے۔ رش کا یہ عالم تھا کہ شرمیلے اور کمزور لاڈلے اور امیر گھرانوں کے لڑکے اپنی "اکنیاں" ہاتھوں میں ہلاتے ہی رہ جاتے اور چھابہ خالی ہو جاتا۔ اور مایوس لڑکوں کو لال سنگھ کا یہ نعرہ مستانہ سننا پڑتا۔

"گڑ گچ ہو گیا"

سکول میں میری دوستی کا دریا تین دھاروں میں بہتا تھا۔ ایک دھارا عبدالرحیم سفور اور قربان حسین شہید جیسے

شاعروں کے ساتھ مشاعرہ بازی کا تھا۔ دوسرے میں لہری (LEHRI) کے میر محمد اور "چکری (CHAKARI) راجگان" کے راجہ غفور سپاہی ابن سپاہی تھے۔ پاکستان آرمی کے ایک کمانڈر انچیف جنرل آصف نواز ان کے قریبی عزیز تھے اور تیسرے دھارے میں جو سکول میں "ہرن منڈلی" کے نام سے مشہور تھا۔ میرے سمیت سنگھولی (SANGHOLI) کے جمشید عالم، چکری کے یار محمد یارن، کوہ مری کے ظہور راجہ اور جہلم شہر کے اشمنی کمار، گورو دت اور خلیل آتش پر مشتمل تھا۔ میں اور گورو دت تو اس "ہرن منڈلی" کے "بیل" بلکہ بھینسے تھے۔ البتہ باقی سب واقعی غزال اور غلمان تھے۔ گورو دت کا "سانڈ" حیرت انگیز بھی تھا کہ وہ آگے چل کر بھارت کے نامور اور وجاہت مردانہ میں بلا کے "قاتل خواتین" (LADY KILLER) "فلمی ہیرو" سنیل دت کے چچا ہوئے۔ شعلہ رخساروں میں اشمنی پہلے نمبر پر تھا۔ وہ گھر سے نکلتا تو شہر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا۔ اشمنی پر تو بعض دل پھینک اساتذہ بھی خاصے "گرم" تھے۔ تھے تو جمشید .....اور ظہور بھی قبول صورت۔ مگر ان کی دلکشی میں کچھ کچھ علاقہ پوٹھوار کا "کرخت پن" بھی نمایاں تھا۔ کبھی معشوق معلوم ہوتے اور کبھی عاشق۔ یارن بھی انگریزوں کی طرح گورا چٹا تھا۔ مگر نسبتاً" بوڑوا تھا۔ بوم سے کتراتا رہتا۔ اس کا خاندان چنے کاشت کرتا مگر وہ لال سنگھ کے چھولوں کے قریب نہ جاتا۔ شہر کی گلیوں (بلکہ کھڑکیوں میں) ان سب کی بڑی مانگ تھی۔

یارن کے سوا ہم سب لال سنگھ کے چھولوں کے رسیا تھے۔ آدھی چھٹی کے وقت ہم بھاگ کر سب سے پہلے اس کے "چھابے" کے سامنے بیٹھنا چاہتے مگر اس خواہش کی راہ میں ہمارے "گھریلو کھانے" حائل تھے۔ جمشید یارن اور گورو دت کے گھروں سے ان کے ملازم بائیسکلوں پر کھانا لاتے مگر اشمنی کا کھانا (اس کی ماتا جی کے سمیت) دو گھوڑوں کی بگھی پر آتا۔ اشمنی کے پتا جی ریلوے کے بڑے افسر تھے اور "ریل" سے اس قدر اکتائے ہوئے تھے کہ اگر ان کی مسلسل نقل و حرکت کی اوسط نکالی جائے تو انہوں نے ریل سے زیادہ "بگھی" پر سفر کیا۔ دستر خوان "فٹن" میں بچھتا۔ اشمنی کی ماتا جی ہم سب کو اس پیار سے کھانا نکال نکال کر دیتیں جیسے وہ ہم سب کی ماتا تھیں۔ میں اور ظہور "مفت خورے"۔ مگر کیا مجال کہ ماتا جی نے کبھی ہمیں اس کا ہلکا سا احساس بھی ہونے دیا۔ بلکہ وہ اتنا کھانا لاتیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں باقی سب کے گھروں کا کھانا آنا بند کروا دیا۔ میٹرک کے امتحان تک ہم "ویشنو بھاجیوں" پر پرورش پاتے رہے۔ ماتا جی طرح طرح کی نعمتیں لایا کرتیں۔ میٹھے میں کھیر، رس گلے، گلاب جامن میں سے کوئی ایک چیز ضرور ہوتی۔ موسم کا میوہ بھی ہوتا جس کی ریلوے والوں کے ہاں کوئی کمی نہ تھی مگر ہم سب کی "بھوک" لال سنگھ کے چھولوں میں اٹکی رہتی۔

اور جیسے ہی ماتا جی کی فٹن واپسی کے لئے حرکت میں آتی ہم دوڑ کر لال سنگھ کے پاس جا پہنچتے۔ "رس ملائی" کے مقابلے میں گندے مندے چھولوں کی کشش پر مجھے اب اپنا فوج کے زمانے کا ایک انگریز رفیق کار کیپٹن ڈونلڈ الائے (Donald Alloe) یاد آ جاتا جو سنگاپور کے "بازار حسن" کی مہ جمال چینی لڑکیوں میں سب سے میلی لڑکی پسند کرتا۔ فٹن کا جشن اپنی جگہ، چھولوں کا چسکا اپنی جگہ۔ ہم لوگ "فٹن" سے پیشتر بھی باری باری چھولوں کو "ٹھونگ" آتے۔ میرے اور جمیشد کے لئے ماسٹر ووھاوا مل کا ریاضی کا پیریڈ (Period) ناقابل برداشت تھا۔ اشمنی اور گورو دت

پر فارسی گراں گزرتی اور ظہور کی جان عربی کے مولوی محمد اشرف صاحب نے ضیق میں کر رکھی تھی۔ میں اور جمشید اکٹھے جاتے اسی طرح باقی سب اپنے اپنے "فاعون" میں۔ ہمارا شمار سکول کے مشہور لڑکوں میں ہوتا۔ ہم سکول میں شیطان کی طرح مشہور تھے۔ ہمارے نام سے ہر کوئی واقف تھا۔ مگر لال سنگھ کے لئے جمشید "مکھن جی" تھا اور میں "کھنڈ جی"۔ یہ ہمیں وہ چھولوں کا "دونا" خوب لبالب بھر کر دیتا۔ وقت پر بھی جاتے تو کہتا "**سوہنیو!** بڑا انتظار کراندے او"۔ لمی راہ وکھاندے او" (لمبی راہ دکھاتے ہو)۔ ابتداء میں وہ "دونا" بھی بھر کر دیتا۔ کلچہ بھی خوب چنتا۔ "تری" کے بھی ایک کی جگہ تین چمچے ڈال دیتا۔ مرچوں سے اگر ناک بہنے لگتا تو اپنے "پرنے" سے ہماری ناک پونچھ دیتا اور اس عمل میں ہمارے گالوں کو بھی سہلاتے سہلاتے صاف کر دیتا۔ پھر یہ ہوا کہ وہ چھولے بھی کھلاتا اور ہماری "اکنی" بھی واپس کر دیتا۔

رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہمارے لین دین میں "اکنیاں" درمیان سے نکل ہی گئیں۔ صرف چھولے اور لال سنگھ ہی رہ گئے۔ اب "ڈرل" (DRILL) یہ تھی کہ ہم ایک ہاتھ سے اکنی اس کے ہاتھ پر رکھتے اور وہ دوسرے ہاتھ سے وہی اکنی بلکہ بعض اوقات "دونی" ہمارے ہاتھ میں تھما دیتا۔ ساتھ ساتھ کہتا جاتا ____ "کھنڈ جی"۔ آپاں دا تے تہاڈا کی ونڈیا ہویا ایہہ"۔ (ہمارا تمہارا کچھ الگ نہیں)۔ ہاتھ میں "اکنی" تھماتے ہوئے وہ کچھ دیر تک ہاتھ پکڑے رکھتا اور ہتھیلیوں پر گدگدی کرتا رہتا۔ جیسے کچھ ہمارے ہاتھوں پر لکھ رہا ہو۔ اس کارروائی کے درمیان یہ بھی پوچھتا۔ "کج سواد آیا" (کچھ مزہ آیا)--- ہم جب تک جواب میں یہ اقرار نہ کرتے کہ ہاں آیا' لال سنگھ ہمارا ہاتھ نہ چھوڑتا۔ جس دن متھا ٹیکنے گوردوارے جاتا تو دونا لنگر کے صابونی حلوے کا ہمارے لئے بھر لاتا۔ ہاتھ دباتے وقت دیکھتا ہمیں "ٹیری آنکھ" سے مٹکاتا اپنی تندرست آنکھ کو۔

شروع شروع میں ہمیں اس کی یہ حرکتیں ناگوار لگتیں۔ بعض اوقات اس کی ایک آنکھ ہی میں کچھ اس قسم کا لاوا بھرا بھرا نظر آتا کہ لال سنگھ سے ڈر بھی لگنے لگتا۔ بعض اوقات یہ گمان بھی گزرتا کہ یہ جھلا (پاگل) سکھ کہیں ہم سے عشق تو نہیں لڑا رہا۔ میں جمشید سے کہتا یہ دراصل تم پر واری صدقے جا رہا ہے۔ میں تو لکڑی کے ساتھ گویا لوہا تیر رہا ہے۔ وہ مجھے مذاق میں کہتا۔ "میرا چہرہ چمکیلا ہے مگر تیرا جسم رسیلا ہے۔ لال سنگھ چومے گا مجھے اور برتے گا تجھے۔ مگر پھر سکھوں کی روایتی فیاضی اور زندہ دلی کی روایت سب وسوسوں پر غالب آ جاتی۔ بلکہ شاید ہم اس صورت حال کا مزہ لینے لگ گئے۔ سودا نفع کا تھا۔ مفت چھولے اور کلچہ ڈکار رہے تھے۔ وہ فی کس چار آنے یومیہ کی چوٹ کھا رہا تھا جو ان ایام میں ہمارے لئے خاصی رقم تھی۔ یہ کچھ ایسا چسکا تھا کہ "**لٹن**" میں ہم حاضری کی رسم ہی پوری کرتے۔ پیٹ ناغے کی "ٹلی" میں لال سنگھ کے چھولے کلچے سے ایک قسم کے تخلیے میں لال سنگھ کی باتیں اور بقول جمشید اس کی ایک آنکھ کی ہنڈرڈ میٹر (Hundred Meter) دوڑ میں بھی ایک ایسی کشش تھی جو سچی بات یہ ہے کہ ہمیں بے چین رکھتی تھی بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا کہ ژولیدہ بھجنگ لال سنگھ اپنے گھٹنے سمیت ہمارے اندر گھستا چلا آ رہا ہے۔

لال سنگھ اور ہم دوستوں کی الگ الگ "چھولا نشست" کا پردہ بھی آخر درمیان سے ہٹ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ

ہم سب سے عشق کر رہا تھا۔ گویا اس جھلے سکھ نے "معشوقوں" کا "اجڑ" پال رکھا تھا۔ جن پر وہ ڈیڑھ روپیہ یومیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔

ہم اپنے اپنے "عشق" ایک دوسرے سے چھپائے ہوئے تھے۔ ذکر بھی کبھی آیا تو سرسری سا۔ مگر عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ لیکن ہمارا بھانڈا تو ایک ناگوار واقعے کے باعث بڑے دھماکہ کے ساتھ کھلا۔ اشمنی اور گورو دت ایک روز منت سماجت کر کے یارن کو "چھولا خوری" کے لئے ساتھ لے گئے۔ "یارن" لال سنگھ کو کچھ اتنا پسند آیا کہ پہلے ہی دن اس کی "اکنی" واپس کر کے اس کو "معشوقوں کے رجسٹر" میں چڑھا لیا۔ یہاں تک تو خیر غنیمت تھا مگر "اکنی" واپس کرتے ہوئے لال سنگھ کی جو شامت آئی کہ اکنی ہاتھ پر رکھنے کی بجائے وہ اکنی کو یارن کے گال پر رکھ کر اکنی کو دبانے' گھمانے' رگڑنے لگ گیا۔ اس پر یارن نے کہ غصہ اس کے ناک پر دھرا رہتا تھا' لال سنگھ کو وہ رگڑا دیا کہ اس کا چھابہ الٹ گیا اور اس کی اپنی ناک سے اتنا خون جاری ہوا کہ لال سنگھ سر سے پاؤں تک لال ہو گیا۔ بعد میں "بڑے ڈرامائی انداز میں' بات کچھ لال سنگھ نے بھی بڑھائی۔ سکھ "عاشق" بھی غصے میں آ کر معشوق کو مارنے لگتا ہے۔ اس نے یارن کے منہ پر جوابی ہاتھ اٹھایا تو اشمنی اور گورو دت بھی اس پر ٹوٹ پڑے۔ بات ہیڈ ماسٹر لالہ بھگوان داس تک پہنچی تو انہوں نے لال سنگھ کا خوانچہ اٹھوا دیا کہ نہ بانس ہو نہ بانسری بجے اور راجہ غفور کو جس نے یارن کی کمک پر آ کر لال سنگھ پر ہاکی اسٹک سے ایک کاری وار کیا تھا' ایک برس کے لئے سکول سے نکال دیا گیا۔ یارن پہلے بھی اس مشغلے کے خلاف تھا۔ وہ اکثر اس بے غیرتی پر ہمیں لعنت ملامت کرتا رہتا۔ کہا کرتا۔

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

مگر ہم اس کو سمجھاتے کہ یہ تو ایک اشغلہ ہے دل کے خوش رکھنے کو۔ ظہور راجہ (جو بعد میں ہندوستان کی فلمی دنیا میں ہیرو بن کر ابھرا) یارن سے کہتا یار ما دلدار ما۔ خدا کی قسم ہم تو ڈراما کھیل رہے ہیں۔ مگر اس دن یہ ڈرامہ آخری "سین" پر آ گیا۔ سکول سے خارج کر دیا۔ بہرکیف یہ واقعہ ہمارے سکول کی تاریخ میں ایک مدت تک اسی طرح یاد رکھا گیا جس طرح جہلم شہر میں دریائے جہلم کی 1929ء کی کانگ کی تباہ کاری یاد کی جاتی ہے۔ میں جب یہ سطور لکھ رہا ہوں اس واقعے پر چھیاسٹھ برس گزر چکے ہیں مگر لال سنگھ نے میرے اندر زندگی کا کوئی ایسا لمس جگایا کہ لال سنگھ اب بھی میری زندگی میں شامل ہے۔

نثری نظم کو تقویت

اور

سوچوں کو ندرت دینے والا نیا مجموعہ

ماسوا

سلیم شہزاد

ادب میں نئے نقش ثبت کر رہے ہیں

سفر نامہ-2-

جس کو دیکھا خُمار میں دیکھا

مستنصر حسین تارڑ

کہا جاتا ہے کہ میرے جیسے کوئی صاحب دہلی میں کوئی کوچہ تلاش کر رہے تھے۔
ایک صاحب سے پوچھا "کیوں صاحب ___ کوچہ باقر علی کو یہی راستہ جاتا ہے"۔
جواب آیا "آہو....."
اب ان کے کچھ پلے نہ پڑا کہ یہ "آہو" کیا ہے اور کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ راستہ کوچہ باقر علی کو جاتا ہے ___ یا راستہ کوچہ باقر علی کو نہیں جاتا۔ ایک اور صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی سر ہلا کر ایک گونج دار "آہو" کہا۔ جب تیسرے صاحب سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا "جی ہاں قبلہ آپ درست سمت میں جا رہے ہیں۔ یہی راستہ کوچہ باقر علی کو جاتا ہے" تو یہ صاحب خوش ہو کر بولے "اجی حضرت آپ اس اوراق مصور دہلی میں پہلے شخص ملے ہیں جو ماشا اللہ نہایت تہذیب یافتہ ہیں"۔
اس پر ان صاحب نے ایک پاٹ دار آواز میں کہا "آہو....."
کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک سندھی سٹی کراچی ایک اردو سٹی بن چکا ہے تو قلعہ معلی کی زبان اردو کا رکھوالا دہلی اگر ایک پنجابی سٹی بن چکا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔
وہاں ستیندر پرکاش بھی تھا..... پتہ نہیں کس منسٹری میں کیا کرتا تھا لیکن جب انگریزی بولتا تھا تو اسے ایک ایسے مترجم کی ضرورت پڑتی تھی جو اس کی انگریزی کو انگریزی میں ترجمہ کر سکے۔ لیکن بے دریغ اور بے تکان بولتا تھا۔ ہمارے ہاں اپنے آپ کو آزار میں ڈال کر اگلی صبح قبض کا خدشہ مول لے کر منہ بگاڑ کر درست لہجے میں انگریزی بولنے کا تردد کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کو اس قسم کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ وہ اس سلسلے میں کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہیں اور جو بیان کرنا چاہتے ہیں بے دریغ بیان کر دیتے ہیں۔
اینو گھوش..... ایک ایسی خاتون جو گوروں کی رگ رگ کو جانتی تھی اور اپنی رگ حمیت کو فراموش کر کے ان کی اسی رگ پر ہاتھ رکھتی تھی جو ان کی دکھتی رگ نہ ہوتی تھی۔ اینو کے بال خضاب زدہ ہونے کے باوجود اس کی خزاں رسیدگی کا مداوا نہیں کر سکتے تھے۔ کھنڈر بتاتے تھے کہ کبھی عمارت عظیم نہ سہی ایسی تو رہی ہو گی کہ اسے رک کر صرف ایک پل کے لئے دیکھا جا سکے۔ لیکن اب ان کھنڈروں کے اندر جانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔

دپتی گلاتی سے میں نے سلاد کے پتے چباتے ہوئے اور بساند آمیز دال چاول نگلتے ہوئے پوچھا "آپ اس کانفرنس میں کیسے آئیں؟"

"مجھے تو پشو پال ناتھ جی نے بلا لیا" انہوں نے اپنے ٹھینگے قد کے باوجود ذرا اٹھلا کر کہا۔

میں چونکہ ان ناتھ جی کی کرامات کا تذکرہ اپنے ٹیکسی ڈرائیور سے سن چکا تھا اس لئے فوراً متوجہ ہو گیا "کیسے بلا لیا؟"

"نیو دہلی میں میرے گھر کے سامنے ___ ایک چوکور لان ہے--- پھولوں کی کیاریاں ہیں اور کچھ گھاس ہے۔ ایک سویر میں اٹھی، کھڑکی کے پردے ہٹائے تو وہاں بہت ساری گائیں گھوم رہی تھیں اور گئو ماتا کی بھی مجبوری ہے کہ وہ لید بھی کرتی ہے"۔

"واقعی؟" خالدہ سرگوشی نہایت سنجیدگی سے حیران ہو گئی۔

"سنا ہے ان کا پیشاب بھی مقدس ہے اور اس کے پینے سے بندہ سیدھا سورگ میں جاتا ہے؟"

فاروق نے پوچھا۔

"ہم سب کا سورگ الگ الگ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ہمارے ہاں جو مسلمان ہیں وہ اپنے پیر کی تھوک کو چاٹ لیتے ہیں۔ تو ہم سب کا سورگ الگ الگ ہے"۔

فاروق چپ ہو گیا۔

"اور مجھے....." دپتی نے اپنے گورے چٹے سینے پر ہتھیلی رکھ کر کہا "مجھے آپ سورگ بھی دو تو بھی میں گئو ماتا کے پیشاب کو پینا تو کیا سونگھوں بھی نہیں۔ یہ کون آپ کو ہندوؤں کے بارے میں اس قسم کی باتیں بتاتا ہے؟"

"ہم خود ہندوؤں کے بارے میں اپنے آپ کو اس قسم کی باتیں بتاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہماری بقا اسی میں ہے"۔

"تو میرے گھر کے سامنے جو لان تھا اس میں گئو ماتا لید کرتی پھرتی تھی تو مجھے سخت برا لگا۔ بہت گھن آئی کہ یہ یہاں گندگی پھیلاتی ہیں۔ اور میں نے کھڑکی بند کر دی اور اسی دوپہر مجھے فون آگیا کہ آپ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے چن لیا گیا ہے تو مجھے سخت شرمندگی ہوئی"۔

"کیوں شرمندگی ہوئی؟"

"میں نے سوچا کہ جدھر سے بلاوا آیا ہے.... کھٹمنڈو شہر ہے..... وہیں تو پشو پال ناتھ جی کا مندر ہے جس میں جانور گھومتے ہیں۔ بندر، سور، بھیڑ بکریاں اور گائیں بھینسیں موج کرتی ہیں۔ یاتری ان کے بھی چرن چھوتے ہیں اور وہاں اس مندر کی پوتر تا میں گائیں لید کرتی یں، پیشاب کرتی ہیں لیکن پشو پال مائنڈ نہیں کرتے۔ اور میں اپنے گھر کے سامنے جو لان ہے اس میں لید کرنے والی گائیوں کو مائنڈ کرتی ہوں اور اس کے باوجود انہوں نے مجھے کھٹمنڈو بلا لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں ناں کہ "پشو" کا مطلب جانور ہوتا ہے ___ پشو پال ___ جانوروں کو پالنے والا"۔

"جی ہاں.... میری ماسی صاحبہ جب ہم بچوں کے میلے کچیلے اور گندے مندے رہنے سے اور غلیظ جوہڑوں میں

نہانے سے عاجز آ جاتی تھی تو کان دبوچ کر کہتی تھی "اوئے تم بندے ہو کہ پشو...." اور ان زمانوں میں ہمارا خیال تھا کہ "پشو" کشمیری پشمینہ کی کوئی قسم ہے"۔

"تو بس اسی دوپہر کو بلاوا آ گیا"۔

"اچھا---" میں سبزی ترکاری اور دال چاول کو نگلتے ایک کھیت میں منہ مارتے پشو کی طرح بیزار ہو چکا تھا" آپ کو بھی بلاوا آتا ہے؟"

"کیوں ہمیں نہیں آ سکتا؟"

"پتہ نہیں۔ لیکن آپ تو ہندو لوگ ہیں۔ بلاوا تو ادھر سے۔ مکے مدینے سے آتا ہے"

"اچھا---" دپتی کی سرمہ زدہ آنکھیں اچنبھے اور بے یقینی سے پھیلتی گئیں "لیکن ہمارا خیال تھا کہ بلاوا صرف پشو پال ناتھ جی کی جانب سے ہی آتا ہے"۔ اس کی حیرت مجھ سے بڑی تھی۔

بلاوا دراصل کس کو آتا ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے۔

ہر پختہ ایمان والا شخص یہی کہتا ہے کہ بلاوا صرف مجھے آتا ہے۔

مہاتما بدھ کو جنگل سے بلاوا آتا ہے کہ اپنا راج پاٹھ ترک کر اور ادھر آ جا۔

موسیٰ کو کوہ طور بلاتا ہے۔

رام کو سری لنکا سے پکارا جاتا ہے۔

گورونانک کو فرید بلاتا ہے کہ ۔ اٹھ فریدا ستیا صبح نماز گزار---

منصور حلاج کو دار بلاتی ہے کہ آ ____ اپنے نعرہ انا الحق کے ساتھ آ اور مفتیان دیر و حرم کے فتوؤں کی پاداش میں سولی پر سج جا اور جب تیرے ہاتھ پاؤں قلم ہوں اور تب اذان کی صدا بلند ہو تو اپنے خون سے اپنے چہرے کو وضو سے آشنا کر اور نماز گزار---

کسی کو حسین بلاتا ہے اور وہ لکڑی کے صندوقوں میں لیٹ کر کراچی کے ساحل سے رواں ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور کبھی کوئی سلطان باہو--- اس پکار پر دھیان رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر رب نہانے دھونے اور وضو کرنے سے ملتا ہو تو ہ مینڈکوں اور مچھلیوں کو مل جائے۔ اگر وہ ذات' جنگل بیلے میں گم ہو جانے سے مل جاتے تو ڈھور ڈنگر اور مویشیوں کو مل جاتے۔ یہ نفل نماز زنانے کام ہیں اور اونچی آواز میں وہی اذان دیتا ہے جس کی نیت کھوٹی ہو--- ہو---

اور جب میرے ایک بزرگ اور پسندیدہ شاعر موہن سنگھ کو بلاوا آتا ہے تو وہ "ساوے پتر" میں کہتا ہے کہ رب اک گورکھ دھندا--- جس کی گتھیاں کھول کھول کے کافر ہو جائے بندا---- اور لائی لگ مومن کی نسبت--- ایک طے شدہ رائے پر آنکھیں بند کر کے ہنسنے والے مومن سے۔ کھوجی کافر چنگا--- وہ کافر بہتر ہے جو کھوج میں رہتا ہے۔

بلھے شاہ نے بھی یہی پکار کی تھی۔ کی جاناں میں کون او بلھیا

شاید میں بھی وہی کافر تھا جو کھوج میں رہتا ہے۔
تو بلاوا کس کو آتا ہے--- اس کا فیصلہ کون کرے۔

اس نازک اور گورکھ دھندے لمحے میں خالدہ سرگوشی نسوانی کمزوریوں کی کمک لے کر پہنچ گئی "ویسے دپتی--- اور آپ کو دیکھ کر مجھے دپتی نول یاد آ جاتی ہے۔ یہ جو پنک سویٹر آپ نے پہن رکھا ہے اس کا رنگ آپ کے رنگ سے بہت سوٹ کرتا ہے اور آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں!!

دپتی اپنے فربہ اور مختصر قد کے ساتھ سرخوشی میں جتنا ہنس سکتی تھیں، ہنسیں اور میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ اگر وہ کھڑی نہ ہوں اور دوپہر کے کھانے کی میز پر یونہی براجمان رہیں تو اس پر کوئی مڈل ایج بندہ باآسانی عاشق ہو سکتا تھا۔

"ریتلی..." دپتی اپنی "پیاری لگ رہی ہیں" کے کومنٹ پر ذرا بلنش کر گئیں اور قدرے سرخ ہو گئیں اور پھر اپنے پنک سویٹر پر ایسے ہاتھ پھیرنے لگیں جیسے ایک ریچھ جو قدرے گورا چٹا ہو اور آنکھوں میں سرما لگاتا ہو اپنی من پسند ریچھنی سے تفصیلی ملاقات کے بعد اپنی کھال پر ہاتھ پھیرتا ہو۔

چنانچہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا آفٹر نون سیشن میں ہم سب طوطے ہو گئے۔ لیکن ہم کوئی ناتجربہ کار طوطے تھوڑی تھے کہ یکدم چھوٹتے ہی ان کی ہاں میں ہاں اور ٹیں میں ٹیں ملانے لگتے۔

ہم تادیر اپنی دانش مندی واضح کرنے کے لئے سرہلاتے رہے۔ پھر کہیں جا کر ہم نے اپنا پہلا "ٹیں" کیا۔

اور پھر ذرا کوفت کے بعد دوسرا "ٹیں"۔ اب ہمیں نینا کے کردار میں وہ خوبیاں نظر آنے لگیں جو اسے کسی صوفی بزرگ کے رتبے کے آس پاس لے جاتی تھیں۔ وہ ہمیں مرحومہ ڈیانا کی کوئی گمشدہ کزن نظر آنے لگی اور نیپال کی نژاد فلم ایکٹرس منیشا کوئرالہ کی نزدیکی عزیزہ لگنے لگی۔ میری آن نے ہمارے سارے گناہ معاف کر دیئے اور اپنے رگڑے ہوئے چہرے کی تختی پر ایک شاباشی مسکراہٹ پھیلا لی۔ ہمیں بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم بھی کیسے ناشکرے لوگ ہیں کہ اپنے مہربانوں، قدردانوں پر تنقید کرتے ہیں جن کی وجہ سے ہم نے پچھلی شب ایک لیونگ گاڈیس کو دیکھا تھا۔ دھوکا دربار کی دھوکا شام میں کلا ستزا کے آسنوں کی زیارت کی تھی۔ ہم کیسے ناشکرے تھے۔

اور اس کے باوجود میری نگاہ بار بار وینشن بلائنڈز سے نابینا کی گئی اس کھڑکی کی جانب جاتی تھی جس کے پار وہ تین شگوفہ بردار میرے برادر درخت تھے جو صرف میرے رشتے دار تھے۔ باہر کیا کیا ہے اور میں کہاں بیٹھا ہوں اور صرف حق نمک ادا کرنے کے لئے مجبوراً بیٹھا ہوں۔

"کے ٹو کہانی" کے ایک ساتھی عامر نے اپنے صنعتی کلچر کی جکڑ بندی سے آزاد ہونے کے لئے ایورسٹ کے بیس کیمپ تک ٹریک کرنے کا پروگرام بنایا "تارڑ صاحب آپ چلیں گے؟"

"میں اگرچہ اس کوہ نورد سے ذرا سی بہتر جسمانی حالت میں ہوں جو نیم معذوری کی حالت میں بیساکھیاں ٹیکتا پورٹرز کے کندھوں اور بانہوں کا سہارا لیتا کے ٹو بیس کیمپ تک جا پہنچا تھا... تو اب سوال ایورسٹ کا ہے تو ہم کتنی ہائٹ تک جائیں گے......؟"

"تقریباً انیس ہزار فٹ تک...."

میں نے فوراً حساب لگایا کہ میں آج تک زیادہ سے زیادہ کتنی بلندی پر پہنچ کر زندہ بچا ہوں..... شائد ہیسپر پاس' تقریباً سترہ ہزار فٹ اور وہاں میرا سانس خیمے کے پردے سے ٹکرا کر برف کی پھوار بنتا تھا اور میرے چہرے پر چھڑکاؤ کرتا تھا اور سانس کبھی آتا تھا اور کبھی نہیں آتا تھا اور کبھی شائد ٹھہر بھی جاتا تھا تو اس میں اگر ہزار دو ہزار فٹ مزید جمع کر لئے جائیں تو کیا نتیجہ نکلتا ہے..... تجربہ کار کوہ پیماؤں نے خبردار کیا تھا کہ اٹھارہ ہزار فٹ کے بعد "ڈیتھ زون" شروع ہو جاتا ہے اور وہاں آپ کے پھیپھڑے کسی بھی لمحے بغیر وارننگ کے بھک سے اڑ سکتے ہیں اور ان کی اڑان کے ہمراہ جو شے پر پھڑپھڑاتی چلی جا رہی ہو گی وہ آپ کی روح ہو گی..... چونکہ میں اپنی روح کو اچھی طرح جانتا تھا اور یہ جانتا تھا کہ میری روح ذرا سا روح پرور نظارہ بھی دیکھ لے تو میرے بدن کو چھوڑ کر مائل پرواز ہو جاتی ہے جیسا کہ اس نے وادی سوختر آباد میں کیا تھا اس لئے قابل فہم طور پر میں ذرا دل گرفتہ اور پریشان ہو گیا "پتہ نہیں میں اتنی بلندی سہار سکتا ہوں کہ نہیں...."

اور عامر نے مجھے جو جواب دیا میں اس نیک سیرت نوجوان سے اس کی امید نہ رکھتا تھا "تارڑ صاحب محبوب چاہے کتنا ہی فربہ کیوں نہ ہو اس کا وزن سہارا جاتا ہے" "لیکن یہ تو ..... میرا مطلب ہے بہت مہنگا سودا ہو گا....."

"آپ نے اپنے خرچے سے صرف کھٹمنڈو پہنچنا ہے اور اس کے بعد تمام انتظامات..... تک ایک گھنٹے کی ایئر فلائٹ' وہاں سے آگے چار دن کا پیدل ٹریک.... کھانا پینا خیمے' پورٹر اور گائیڈ..... یہ سب میرے بزنس کونیکشن کے ذمے ہوں گے۔ آپ اپنے ہمراہ صرف ایک سلیپنگ بیگ لے کر جائیں گے"

میں نے اس شام اپنے سلیپنگ بیگ کو ڑک سیک میں سے نکالا اور اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر ایک سرد آہ بھری.....

اور انہیں آخری لمحوں میں کیا وقوعہ ہوا.... عامر اپنے صنعتی کلچر کی کسی مشین کے میکانزم میں پھنس کر بے بس ہو گیا "تارڑ صاحب مینوں معاف کردیو..... میرا نکلنا ناممکن ہو گیا ہے..... لیکن آپ چلے جائیں کھٹمنڈو میں۔ بقیہ گروپ آپ کا انتظار کر رہا ہے....."

میں نے اپنے آپ کو کھٹمنڈو سے پرے ایک غیر ملک اور غیر خوراک اور غیر خداؤں والی سرزمین میں مکمل اجنبیوں کے ہمراہ کوہ نوردی کی مشقت کے شب و روز میں مبتلا دیکھا تو اس تصویر کے ساتھ مفاہمت نہ کر سکا..... "نہیں عامر.... تمہارے بغیر نہیں"

میرے گمان میں یہ تو تھا کہ میں کبھی اتنے برسوں کے بن باس کے بعد کہیں نہ کہیں لوٹوں گا۔ یورپ .... ایشیا ..... کہیں نہ کہیں ..... لیکن کھٹمنڈو تو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

مجھے بھی بلاوا آگیا تھا۔

میں نے سوچا اس پشوپتی ناتھ جی کا پتہ کرنا چاہئے کہ کیا یہ اپنے ماننے والوں کو ہی بلاوے بھیجتے ہیں یا دیگر ہم جیسے کفار کے لئے بھی ایک الگ سیکرٹریٹ کھول رکھا ہے۔ ضمیر جعفری کا ایک مصرع ہے کہ ۔ بام تک آئے مئے

گلفام تک آئے نہیں....

میں بھی کھٹمنڈو کی بام تک تو آگیا تھا.... لیکن ایورسٹ کے دامن کی مئے گلفام تک ابھی نہیں پہنچا تھا .... اس مئے گلفام تک پہنچنے کا سامان میرے کمرے میں سوٹ کیس کے نیچے بے آرام ہو رہا تھا .... سنو جیکٹ اور جوگرز .... ان کا بس چلتا تو وہ خود چلنے لگتے کیونکہ وہ اپنی حقیقت میں نہیں تھے ایک لایعنی آرام کی عافیت میں تھے۔

مئے گلفام کا بلاوا کب آئے گا؟

مئے خوار منتظر تھے.... ان کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور وہ زاہدوں کی مجلس میں کروٹیں بدلتے تھے .... اور مئے گلفام کا بلاوا نہ آتا تھا۔

نقل کفر والی بات ہے کہ کفر نہ باشد .... ایک لاہوری مائی صاحبہ اندرون شہر کی کٹڑی میں سے زندگی میں پہلی بار باہر نکلی کہ انہیں بھی بلاوا آگیا تھا اور مسجد نبوی میں زار و قطار روتی ہوئی پائی گئیں۔ کسی نے ان کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر پوچھا مائی جی اتنا کیوں رو رہی ہیں؟ مائی کہنے لگیں' پتر میں لاہور سے آئی ہوں .... اور آج داتا صاحب کا عرس ہے اور میں کہاں بیٹھی ہوں..... تو میں بھی اس جاہل مائی کی طرح تھا .... اور اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کہ..... میں کہاں بیٹھا ہوں ..... یہ پوچھ رہا تھا جب کرچن نے پرائمری سکول ٹیچرز والی انگلی اٹھا کر اسے میری طرف سیدھا کیا "مسٹر تزار تمہارا کیا خیال ہے؟"

مسٹر تزار نے اگرچہ پچھلے دو گھنٹے سے کانفرنس کی پر مغز تقریروں کا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا اور اپنے سامنے رکھی آفیشل نوٹ بک پر چڑیاں طوطے بناتے رہے تھے یا کھڑکی کے باہر اپنے دوست درختوں کی جدائی کے غم میں چشم نم رکھتے تھے' ایورسٹ کے بلاوے کا انتظار کرتے تھے..... اور پشتو پتی ناتھ جی کے چرنوں کو چھونے کے ملحدانہ عمل کے بارے میں غور کرتے تھے' وہ کیا بتاتے کہ ان کا کیا خیال ہے..... لیکن ایک مکار سیاست دان کی طرح اور وہ کونسا ایسا سیاستدان ہے' کم از کم ہمارے ملک میں جو مکار نہیں ہوا سوائے بابا جناح کے.... میں نے کھانس کر اور انگلی سے اپنی ابرو سنوار کر کہا..... "اگر ہم معروضی حالات کے بہاؤ کا تنقیدی جائزہ لیں اور صدق دل سے کائنات میں جنم لینے والی آفاقی تبدیلیوں کو بروئے کار لا کر ان بے پایاں مسائل کا تجزیہ کریں جو تیسری دنیا کے گرد غربت۔ جہاد اور بیماری کی صورت میں سیاہ بادلوں کی طرح منڈلا رہے ہیں اور ان کی تہہ تک پہنچنے کے لئے آپ سعی بے مثال کریں تو انسانی جذبوں کی توقیر صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب ہم انسانیت کی مرتی ہوئی لاش پر..... بلکہ لاش تو پہلے سے مر چکی ہوتی ہے ہم انسانیت کے بیمار بدن پر نوحہ کناں ہوں تو پھر ہم بالاخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کردار..... آپ کا تخلیق کردہ نینا کردار ہی ہمہ گیر آفاقیت کا مظہریہ کردار ہی امید کی آخری کرن ہے.... اور.....

اور یہ سب کچھ میں نے بہ زبان انگریزی ادا کیا اور نہایت دقت سے ڈھونڈ ڈھونڈھ کر وہ لفظ استعمال کئے جو شائد ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں بھی متروک ہو چکے تھے.... میری دانشوری اور علمیت کی دھاک مندوبین کی جڑوں میں بیٹھ گئی اور ہر سو ایک عقیدت آمیز سناٹا چھا گیا..... آپ کے نظریات اور عقائد کی تائید میں کوئی دوسرا شخص چاہے کتنی ہی بے سروپا گفتگو کیوں نہ کر رہا ہو آپ اسے آب حیات کی طرح حلق میں انڈیلتے جاتے ہیں اور سر ہلاتے چلے جاتے

ہیں اور کرچن اور میری آن اور دیگر ڈیلی گیٹ سر ہلاتے چلے گئے۔ طوطا اگر راہ راست پر آجائے تو کیا کمال کا طوطا ہوتا ہے۔

صرف باہر جو تین درخت میرے دوست اور برادر تھے وہ جانتے تھے کہ میں لایعنی گفتگو کر رہا ہوں۔ میں نے ونیشن بلائنڈز کی نابینائی میں پوشیدہ ان تینوں کی جانب دیکھا اور ایک بے ایمان لفنگے کی طرح آنکھ ماری کہ بس مٹھی بند رکھو اور چپ رہو اور کسی کو نہ بتانا کہ میں لفظوں کی سیڑھیاں چڑھتا چلا جاتا ہوں اور ان میں کوئی معانی نہیں ہیں۔

اور شائد ان میں سے کسی ایک کا شگوفہ فٹ پاتھ پر گرا.... ایک گلابی آنسو کی طرح جو مجھ جیسے جعلی دانشوروں کی مفاہمت پسندی اور کمرشل ازم کے مظاہرے پر ہمیشہ گرتا ہے اور ایسا شگوفہ تیزاب کی طرح گرتا ہے اور فٹ پاتھ میں چھید کر دیتا ہے۔

لیکن میں قطعی طور پر مجرم نہیں محسوس کر رہا تھا کہ میں نے حق نمک ادا کر دیا تھا۔

(جاری ہے)

❀ ❀ ❀

کے ایل نارنگ ساقی ۔۔۔ کی ۔۔۔ مُرتبّہ کتابیں

ادیبوں کے لطیفے (دوسرا ایڈیشن)
انشاء اللہ خان انشاء سے لے کر مجتبیٰ حسین تک اردو کے ادیبوں کے باغ و بہار لطیفوں کا انتخاب
قیمت ۸۰ روپے ★ ضخامت ۲۰۸ صفحات

یادوں کا جشن
آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی دلچسپ خود نوشت سوانح عمری ★ قیمت ۱۷۰ روپے ★ ضخامت ۵۰۰ صفحات

کلّیاتِ سحر
آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا کلام
★ قیمت دوسو روپے ★ ضخامت ۲۵۴ صفحات

ہمارے کنور صاحب
آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے بارے میں کئی مشاہیر اور ادیبوں کے مضامین کا انتخاب۔
★ قیمت ۸۰ روپے ★ ضخامت ۲۸۸ صفحات

ہندوستان کے کسی بھی کتب فروش سے طلب کریں یا براہِ راست لکھیں:۔

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی۔ این ۲۳۹۔ گریٹر کیلاش۔ حصّہ اوّل۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸

بانی: یوسف دہلوی (مرحوم)
مدیران: یونس دہلوی
ادریس دہلوی
الیاس دہلوی

ایک کاپی کی قیمت: پندرہ روپے (Rs 15/-)
سال بھر کی قیمت: ایک سو ستر روپے (Rs 170/-)

مقام اشاعت و صدر دفاتر 1/13-14، آصف علی روڈ،
(کملا مارکیٹ کے سامنے) نئی دہلی 110002

Shama Magazine
1/13-14, Asaf Ali Road,
Opp. Kamla Market, New Delhi - 110002

اشاعت کا 60 واں سال

ٹیلی فون: **Phone : (011) 3232674**
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی

SHAMA NEW DELHI

فیکس: **Fax: + 91 (11) 3235167**

91 (11) 3312601 (ATT: SHAMA)

شمع انڈین نیوز پیپر سوسائٹی، نئی دہلی اور آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس کا ممبر ہے۔
مطبوعہ: پرواز پرنٹرز۔ گلی شاہ تارا۔ اجمیری گیٹ۔ دہلی
ٹائٹل اور رنگین صفحات، مطبوعہ: رتنا آفسیٹ، اوکھلا، نئی دہلی
طابع و ناشر: یونس دہلوی

تخلیق 98ء

انور سدید

1998ء کے دوران تخلیق اور جائزہ تخلیق نے سارا سال ایک دوسرے کی موانست میں گزارا۔ تخلیق نے اپنی درج رجسٹر زندگی کا 29 واں زینہ عبور کر کے تیسویں زینے پر قدم رکھا تو اس کے ساتھ ہی تخلیق 1998ء کا جائزہ اختتام کو پہنچا اور 1998ء کے جائزے نے آغاز کیا۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھئے کہ تخلیق نے اپنی عمر عزیز کے 29 برس ہی مکمل کئے ہیں' جس طرح پرانے زمانے میں نومولود بچے کی تاریخ پیدائش نہ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر میں درج کرائی جاتی تھی' اور نہ اس کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا جاتا تھا' اسی طرح تخلیق بھی ابتداء میں سرکاری رجسٹریشن کے بغیر مجموعہ نظم و نثر کی صورت میں چھپتا رہا ہے۔ چند برس پہلے تک مجھے اس کا سال پیدائش یاد تھا۔ لیکن اب یاد نہیں۔ خود مجھے اپنی پیدائش کا سال بھی بھول چکا ہے۔ صرف ریٹائرمنٹ کا سال یاد ہے جب میں سرکاری ملازمت کے آسمان سے گر کر صحافت کی کھجور میں اٹک گیا تھا۔ اور اس قحط دمشق کا تجربہ کیا جس میں عشق بھی بھول جاتا ہے' اور فراغت کو کتاب کی بجائے اخبار ہضم کر جاتا ہے۔ آپ اسے جملہ معترضہ سمجھئے جو لب قلم پر صرف اس لئے آگیا ہے کہ تخلیق کی پوری زندگی کے ساتھ میں اس کا ہم قدم رہا ہوں۔ اس برس تخلیق پر بھرپور جوانی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ اس کے گرد و پیش میں پریاں نیلے' پیلے' اودے' سرخ اور سبز پیرہن پہنے قطار اندر قطار جھومر ڈال رہی ہیں اور میں اپنی ضعیفی کو سہلاتے ہوئے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں' آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اور آنکھوں کا دم بھی غنیمت ہے کہ قلم اور لفظ کے ساتھ رشتہ قائم ہے اور تخلیق سے محبت و التفات جاری ہے۔ حالانکہ اس راہ میں بعض تلخ تجربات نے قلمی رشتوں کی حرمت ختم ہو جانے کا احساس دلایا اور بعض کرم فرماؤں نے ایسے چرکے لگائے کہ آج جلیل و جمیل انسان راجہ گدھ نظر آنے لگا' میں نے معاشرے کے اس عمل پر تجزیاتی نظر ڈالی اور پھر تخلیق کے اوراق میں گم ہو گیا کہ اس جھوک میں تسکین جان کا کچھ سامان موجود تھا' شاید اس لئے اظہر جاوید نے 1998ء کے دوران 1997ء کے جائزے کو قسط وار اشاعت کی صورت دی جو بات صرف ایک اشاعت میں ختم ہو جاتی تھی' اسے بحث در بحث اور عمل اور ردعمل کی زد میں سال بھر تک لئے رکھا اور مجھے ادب کی دنیا میں موجود رہنے کی ترغیب دی۔ صحافت کی پیشہ وری میں ادب میرے لئے خواب و خیال ہو گیا تو اظہر جاوید نے اپنی دوستی کے

فرغل میں مجھے بھی لپیٹ لیا۔ داتا صاحب کی نگری پر اب شہرت پسندوں کا قبضہ ہے' اظہر جاوید نے اس شہر کے ان نقاب پوش' جاگیردار مدیروں سے دور بھگوان سٹریٹ میں اپنی سبھا سجا رکھی ہے' جہاں شہر میں عطا کرنے والے تکیوں سے دل برداشتہ ہو کر ادیب آتے ہیں۔ اظہر جاوید انہیں مایوسی کی دبیز کہر سے نکالتے ہیں۔ قلم ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہیں اور کہتے ہیں دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے لکھئے اور لکھتے جائیں۔ اس جائزے اور جائزہ نگار کے ساتھ بھی انہوں نے اس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ گویا میری زندگی میں تین برسوں کا اضافہ کردیا میں یہ چوتھا سال بھی ان کی تخلیقی تحریک میں شامل کرتا ہوں۔ شکریہ' اظہر جاوید صاحب۔ بے حد شکریہ!

معاف کیجئے میں جائزہ 1998ء کا آغاز کرنے کے لئے مختصر سا ابتدائیہ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن بات خود بخود پھیلتی گئی اور شاید یہ احساس بھی غالب تھا کہ

انور سدید عمر ضعیفی ہے ایک رات
روکر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

میں نے اس شعر مستعار کے آخری حصے پر عمل کیا اور آپ سے باتیں کرنے لگا۔ اب میں نے اتنی آکسیجن اپنے پھیپھڑے میں بھرلی ہے کہ تخلیق کی تنقید 1998ء کا تذکرہ کر سکوں۔

1998ء کے دوران تخلیق میں جو سب سے زیادہ فکر انگیز مقالہ انگریزی سے اردو میں منتقل کیا گیا۔ اس کے مصنف امریکی تجزیہ نگار سیموئیل ہنٹنگٹن ہیں۔ وہ ایک عرصے سے مختلف تہذیبوں کے تصادم پر کام کررہے ہیں اور اس وقت فوکویاما' برنارڈ ولیوس اور جان ایسپوزیٹو کی طرح بہت زیادہ پڑھے اور بہت زیادہ زیر بحث آنے والے مفکر تمدن و تہذیب شمار ہوتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب تمدنی تصادم اور دنیا کے امن کی تلاش کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوئی تھیں۔ ہمارے ممتاز مترجم ظفر عظیم نے اس کتاب کا ایک باب امریکی رسالہ فارن افیئرز سے حاصل کیا اور اس کا ترجمہ تخلیق میں اپریل 1998ء میں پیش کیا۔ سیموئیل ہنٹنگٹن کی یہ بات بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ وہ مغربی مفکرین کا جو دنیا کو ایک گلوبل ولیج اور عالمگیر سماج کی طرف لپکتا ہوا محسوس کرتے ہیں' ہمنوا نظر آتا ہے لیکن وہ اس قسم کے تصور کو خود پسندانہ اور خطرناک ہی نہیں' غلط بھی تصور کرتا ہے۔ اور مغرب کو بالعموم اور امریکہ کو بالخصوص مشورہ دیتا ہے کہ اسے بین الاقوامیت کی اداکاری اور عالمی سماج کے اتحاد کی باتوں کو ترک کر دینا چاہئے۔

ہنٹنگٹن کی رائے میں مغربی مصنوعات کا پھیلاؤ مغربی سماج نہیں ہے' اسی طرح کوکا کولا پینے سے کوئی روسی مغربی سماج کا حامل نہیں ہو جاتا اور سوشی کھانے تناول کرنے سے کوئی امریکی جاپانی نہیں بنتا۔۔۔ ہنٹنگٹن نے بحث کو دو زاویوں سے پھیلایا ہے۔

1- پہلا زاویہ کوکا کولا استعماریت کا زاویہ ہے
2- دوسرا "جدیدیت" کے رخ کو سامنے لاتا ہے

اس نے پہلے زاویے کو مسترد کر دیا لیکن جدیدیت کے وسیع المعانی اور وسیع البہات پھیلاؤ پر خیال افروز بحث کی ہے اور اس ضمن میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغربی تہذیب کا ظہور آٹھویں اور نویں صدی میں ہوا تھا۔

اگرچہ جدید ہونے سے پہلے بھی مغرب' مغرب ہی تھا لیکن اس کی جدت پسند خصوصیات کا ارتقاء آنے والی صدیوں کے دوران ہوتا رہا۔

ہنٹنگٹن نے لکھا ہے کہ

"مغربی تہذیب کی بنیاد یونانی عقلیت اور فلسفہ' رومن قانون' لاطینی زبان اور عیسائیت پر کھڑی کی گئی تھی"

وہ اسے کلاسیکی ورثہ قرار دیتا ہے اور یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ اسلامی اور روایتی تمدنوں نے بھی کلاسیکی تمدن سے ہی وراثت پائی تھی لیکن اس کا یہ خیال محل نظر ہے کہ جو کچھ اہل عرب اور مشرق کے دانشوروں نے قرون اولیٰ سے حاصل کیا وہ اس درجہ کا پاسنگ بھی نہیں ہے جو مغرب نے حاصل کیا ہے۔ اس قسم کے مقامات پر ہنٹنگٹن کی عیسائیت پسندی نمایاں اور اس کی آزاد خیالی پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اور وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ تک نہیں کرتا کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے پہلے مغرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت مشرق میں دانش و علم اور حکمت کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مشرق میں یہ روشنی غزالی کے توسط سے اور مغرب میں اس کی تاب و توانائی ابن رشد کے وسیلے سے پھیل رہی تھی۔ اندلس مغرب کے قریب تھا۔ اس لیے یہ روشنی مغرب نے بھی مستعار لی اور نشاۃ ثانیہ برپا کر دی' یہاں ہنٹنگٹن نے اس بات کو تو نظرانداز نہیں کیا کہ تصورات عقل و خرد جامد نہیں ہوتے بلکہ یہ زمان و مکان میں سفر کرتے رہتے ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشرقی معاشروں سے جہاں مذہب کو ایک محرک قوت کی حیثیت حاصل ہے' سہما ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک بلاشبہ ٹی یونگ نے اپنے اس نظریے کو فروغ دے کر چین کی کایا پلٹنے کی سعی کی تھی

"بنیادی مقاصد کے لیے چینی علوم اور عملی مقاصد کے لیے مغربی علوم یعنی (Woken Yosei) ضروری ہیں"

اس کی توضیح یہ ہے کہ "روح جاپانی ہو لیکن اہلیت مغربی ہو"۔ اس نے سعودی عرب کے شہزادہ بندر بن سلطان کا یہ اظہار بھی حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے کہ

"غیر ملکی درآمدات چمکیلی اور اعلیٰ ٹیکنیکی اشیاء ہیں لیکن ناقابل فہم سماجی اور سیاسی ادارہ جات کی غیر ملکی درآمد خطرناک ہو سکتی ہے۔ شاہ ایران سے ذرا سوال کریں ___ اسلام ہمارے لیے مذہب ہی نہیں بلکہ زندگی کا رہن سہن بھی ہے۔ ہم سعودی جدید ہونا چاہتے ہیں لیکن مغرب زدہ نہیں"

لیکن ہنٹنگٹن اس خوف سے دوچار ہے کہ

"مقامی سماج کی طرف لوٹ جانے کی لہر ایشیائی اور مسلمان معاشروں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسلام کے احیاء نے ہر مسلمان ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور تقریباً تمام ملکوں میں یہ اہم سماجی ثقافتی اور دانش کی لہر بن چکا ہے۔ زیادہ تر ممالک کی سیاست پر اس کا گہرا اثر ہے۔ 1996ء میں ایران کے علاوہ ہر مسلمان ملک کا رنگ ڈھنگ زیادہ اسلامی اور راسخ العقیدہ مذہب کی طرف مائل تھا۔ ان ممالک میں جہاں اسلام پسند سیاسی قوتیں حکومت نہیں بنا سکیں' وہاں اکثر ان کا غلبہ حزب

اختلاف پر ہوتا ہے۔ تمام مسلمان دنیا میں اپنے معاشروں کی مغرب نوازیت کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں"۔

اس مقالے کا بنیادی مقصد متذکرہ بالا لہر کو اجاگر کرنے اور مغرب کو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے عیسائیت کو حربے کے طور پر استعمال کرنے اور جارحیت پسندی کی روش ترک کر دینے پر آمادہ کرنا نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ہنٹنگٹن نے امریکہ کے رد عمل کو بلاواسطہ طور پر شدت سے ہدف تنقید بنایا ہے اور اس کے دوہرے معیاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جمہوریت کے فروغ کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ اس کے ذریعے مسلمان بنیاد پرست حکومت میں آ جائیں۔ اسلحہ کے پھیلاؤ کی روک تھام عراق اور ایران کے لیے پندونصائح ہیں۔ لیکن اسرائیل کے لیے نہیں--- معاشی ترقی کے لیے آزاد تجارت اکسیر ہے لیکن زراعت کے لیے نہیں--- چین کے ضمن میں انسانی حقوق مسئلہ ہیں لیکن سعودی عرب کے ساتھ نہیں--- تیل کے مالک کویت کے خلاف جارحانہ اقدام کی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کی جاتی ہے لیکن تیل سے خالی بوسنیا کے لوگوں کے لیے ایسا نہیں ہو سکتا"۔

اس مقام پر ہنٹنگٹن امریکہ اور مغرب کا کڑوا نقاد نظر آتا ہے اور اس کا یہ موقف مبنی برحقیقت نظر آتا ہے کہ

"یورپی آفاقیت اب ختم ہو چکی ہے اور امریکی چودہراہٹ اب سمٹ رہی ہے---"

اس مقالے کا منطقی نتیجہ یہ ہے:

"تمام سیاست مقامی سیاست ہے" اور "مغرب کے لیے وقت آ چکا ہے کہ وہ آفاقیت کے سراب کو ترک کر دے اور اپنی قوت---- باہمی ربط و تمدن کے فروغ و تسلسل کے لیے صرف کرے"

جمہوریت کے بارے میں ہنٹنگٹن کا یہ نظریہ بھی نہ صرف قابل توجہ ہے بلکہ اس سے تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک اور ہندو پاکستان میں پرورش پانے والی جمہوریت کے عملی آثار بھی نمایاں طور پر ابھر آتے ہیں:

"جمہوریت انسان کو وسیع المشرب بنانے کی بجائے اقرباء پروری کے رجحان کی طرف مائل کرتی ہے"

ہنٹنگٹن کا یہ مقالہ تیکنیکی نوعیت کا ایک مشکل مقالہ ہے' جس کی اصلاحات کو قابل فہم اردو میں منتقل کرنا بلاشبہ کٹھن کام تھا۔ ظفر عظیم نے اس کا سلیس اردو میں ایسا بامعنی ترجمہ کیا ہے کہ اس مقالے کے داخل مفاہیم تک رسائی مشکل نظر نہیں آتی اور خیال سوچ کی نئی لہروں پر سفر کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اس خیال افروز مقالے کو اہل نظر نے ذرا سی توجہ بھی نہیں دی' جون کے شمارے میں "انجمن خیال" میں صرف دو خطوط چھپے جن میں اس کا تذکرہ ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔ محسن بھوپالی نے داد دی ہے:

"ظفر عظیم کے تراجم ہمارے ادب کا مستقل حصہ بنتے جا رہے ہیں"

اس بیضوی رائے سے جو ظاہر کرتی ہے کہ محسن بھوپالی نے مقالہ پڑھا ہی نہیں' ظفر عظیم صاحب کو کیا خوشی ہوئی ہو

گی۔ بلاشبہ لطیف قریشی صاحب نے یہ مقالہ بڑی توجہ سے پڑھا لیکن ان کے خط میں بھی بعض جملوں کے ترجمے کی ساخت پر صرف اعتراض اٹھایا گیا۔

مقالے کے مندرجات پر بحث انہوں نے بھی نہیں کی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں' شاعروں اور دانش وروں کو سنجیدہ موضوعات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ صرف اپنی غزل کے حسن میں کھوئے ہوئے اور "انجمن خیال" میں اس کی تعریف سننے کے لیے گوش بر آواز ہیں۔ (آپ میری اس رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں)۔

1998ء کے "تخلیق" میں دوسرا اہم مقالہ ریاض صدیقی نے "دو ناولوں کی کہانی" کے عنوان سے پیش کیا۔ اس مقالے کے پس منظر میں بھی یہ حقیقت موجود ہے کہ ہمارے ہاں اردو دان طبقے میں اب سنجیدہ مطالعے کی روایت مفقود ہے' چنانچہ اس مقالے میں بنگالی ناول نگار مہاسوت کے ناول "دروپدی" اور "بریسٹ گور" کا تعارف کرایا گیا ہے تو یہ دونوں ناول اردو والوں کے لیے ناشنیدہ ہیں' ان ناولوں کا انگریزی میں ترجمہ پروفیسر سپوک گیاتری چکرورتی نے کیا جو "کولونیل" اور "پوسٹ کولونیل" تجزیاتی مطالعات کے لیے مشہور ہیں' ریاض صدیقی نے بھی ان تجزیوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ برصغیر میں بنگال' فکشن کی تخلیق میں سب سے آگے ہے۔ متذکرہ ناولوں کے پس منظر میں سماجی اور سیاسی تحریکوں کو بالخصوص زیر مطالعہ لانے کی کاوش کی گئی ہے اور بعض نتائج تو حیرت انگیز طور پر نئے نظر آتے ہیں مثلاً "دروپدی" کے تناظر میں گیاتری کا یہ تجزیہ دیکھئے جو ہمارے لیے بھی چشم کشا ہے:

"ہندوستان اور بنگال کے علاقوں میں نکسل باڑیوں کی قوت اور مرکزیت کو معذور کرنے کے لیے ہندوستان کی حکومت نے روس' چین اور امریکہ کے ایما پر مشرقی پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی تھی کیونکہ اب چین اور روس بھی بائیں بازو کی تربیت یافتہ تنظیموں کو ختم کر دینے کے حق میں تھے تاکہ کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظاموں کے درمیان مفاہمت کا جو رجحان شروع ہوا ہے اس کی باڑھ پر کوئی آنچ آنے نہ پائے۔ ان طاقتور ملکوں کو یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ نکسل باڑی مسلح گوریلے بھاگ کر مشرقی بنگال میں پہنچ گئے ہیں اور شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ کے گوریلوں سے انہوں نے ہاتھ ملا لیے ہیں' اس بات کا امکان بھی تھا کہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد کہیں نکسلائیٹ ہی وہاں کی حکومت پر حاوی نہ ہو جائیں (شیخ مجیب الرحمان خود بھی مغربی پاکستان سے مکمل علیحدگی کے حق میں نہیں تھے اور انتہا پسند نظریاتی بائیں بازو سے خوفزدہ بھی تھے۔ وہ دراصل انتہا پسند دائیں بازو کے قوم پرست تھے"

ریاض صدیقی نے لکھا ہے:

"ناول "دروپدی" کے متن ہی کے حوالے سے تجزیہ نگار نے مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان ٹکراؤ اور اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذکر کیا ہے۔ در پردہ چین' روس' امریکہ اور

اس وقت کے پاکستانی حکمران اس ٹکراؤ کے حق میں تھے تاکہ مشرقی بنگال میں موجود دونوں ملکوں کی فوجیں نکسل باڑیوں کو اس بہانے ٹھکانے لگا دیں' اس ہنگامہ آرائی میں مشرقی بنگال علیحدہ ہو گیا جہاں بعد میں حالات کو کنٹرول کرنے اور بائیں بازو کی طاقت کو کچلنے کے لیے مغربی طاقتوں نے فوجی حکمرانی قائم کر دی جو 1996ء تک قائم رہی"۔

مہاسوت کو پہلی دانشور کا مقام دیا گیا ہے جس نے اپنے ناول "دروپدی" میں تاریخ کے اس غائب گوشے کا کھوج لگایا ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شریمتی مہاسوت نے "دروپدی" میں فکشن تخلیق کیا ہے تاریخ نہیں لکھی' لیکن اس کی خیال آرائی تاریخ کے طالب علم کو ایک نئی جہت سے ضرور متعارف کراتی ہے۔ اس قسم کی ایک اور کاوش ارن دھتی رائے نے "چھوٹی چیزوں کا دیوتا" (God of Small Things) میں کی تھی۔ ریاض صدیقی نے اس ناول کا تعارف سہ ماہی "ابلاغ" میں 1998ء کے دوران کرایا تھا۔ ریاض صدیقی کی اس قسم کی کاوشوں کی جتنی تعریف کی جائے' کم ہے۔

اگر آپ میری اس جسارت کو معاف کر دیں تو میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ظفر عظیم اور ریاض صدیقی کے مقالات نے میرے دیدہ و دل کو روشن کیا تھا لیکن اسلم کمال کا مقالہ "پاکستان میں ادبی مصوری کے پچاس سال" پڑھ کر طبیعت منقبض ہو گئی۔ اس مقالے میں مصور اسلم کمال نے خود اپنے قلم سے اپنی تعریف و تحسین اس انداز میں اور اس افراط سے کی ہے کہ پورے مقالے پر اسلم کمال صاحب خود حاوی ہو گئے ہیں اور عبدالرحمان چغتائی' صادقین اور مسز عباس عابدی جیسے مصور ان کے سامنے بونے نظر آتے ہیں' ایک اقتباس:

"علامہ اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش کے حوالے سے 1977ء کو سال اقبال سے منسوب کیا گیا اور اسے قومی سطح پر منانے کا فیصلہ سرکاری طور پر کیا گیا۔ پنجاب آرٹس کونسل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مرحوم سجاد حیدر نے اسلم کمال کی تخلیقات بسلسلہ شعر اقبال کی نمائش کرنے کی اسے دعوت دی اس میں بعد میں عبدالرحمان چغتائی' صادقین اور مسز عباسی عابدی سابق پرنسپل نیشنل کالج آف آرٹس کے فن پارے جو کلام اقبال پر مبنی تھے' بھی رکھے گئے۔ مسز عباسی عابدی اور چغتائی کا کام مینا توری گیلری میں ڈسپلے (Display) کیا گیا۔ اس کے ساتھ ملحقہ بڑی گیلری صادقین کے لیے' گندھارا گیلری کو اسلم کمال کے کام کے لیے وقف کیا گیا۔ یہ نمائش پنجاب آرٹس کونسل اور لاہور میوزیم کے اشتراک سے اقبال انٹرنیشنل کانفرنس کے موقع پر منعقد ہوئی' مسز عباسی کے 35 اور چغتائی کے 25 فن پارے رکھے گئے' صادقین کے 30 شاہکار تھے اور کسی بھی کینوس کا سائز 4 x 6 انچ سے کم نہ تھا۔ اسلم کمال کے 30 فن پارے تھے۔ جن میں بیس انک (Base Ink) اور برش کے ساتھ ڈرائنگز 22 x 28 انچ میں تھیں' آئل پینٹنگز میں ایک کا سائز 4 x 24 فٹ' دوسری کا سائز 8 x 12 فٹ' تیسری 6 x 8 فٹ اور چوتھی کا سائز 4 x 6 فٹ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مصور کے کینوسز کا سائز صادقین کے کینوسز سے بڑا تھا"۔

مجھے اس وقائع نگاری پر کوئی شک نہیں' یہ صد فی صد درست ہو گی لیکن اسلم کمال کے اپنے قلم سے یہ بھلی معلوم نہیں ہوتی' اس قسم کی خود تعریفی کی چند اور مثالیں حسب ذیل ہیں :

- "جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے طویل دور میں اسلم کمال 4 سال بے روزگار رہا ___ (واضح رہے کہ پاکستان گیارہ برس تک ضیاء الحق کے شکنجے میں پھنسا رہا تھا)
- "1995ء میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس نے اقبال اکادمی یورپ کے زیر اہتمام "اقبال اور فنون لطیفہ کے عنوان سے بین الاقوامی کانفرنس بمقام برمنگھم یونیورسٹی میں کلام اقبال کی مصوری کی نمائش کے لیے اسلم کمال کو بھیجا"
- "1997ء میں "اقبال اور ایشین رینا سانس" کے موضوع پر کوالالمپور میں بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر اسلم کمال کی اقبالیاتی مصوری کی نمائش کے لیے اس کو حکومت ملائشیا نے دعوت دی اور وہاں پر سرکاری مہمان کی حیثیت سے پذیرائی کی۔
- "اکادمی ادبیات پاکستان اور قومی کمیشن برائے ہسٹری اینڈ کلچر نے (پاکستان کی تخلیقی کائنات کے) کارنامے کو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کرنے کے لیے لکھا اور اسلم کو کسی اعلیٰ سول ایوارڈ کے لیے نامزد کرتے ہوئے اس کے تصویری کارنامے کے بارے میں لکھا---- (اس سے آگے اکادمی ادبیات کا تعریفی و توصیفی اقتباس ہے)

اسلم کمال پاکستان کے باکمال مصور ہیں' ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا' لیکن اگر وہ اپنے قلم کو خود اپنی تعریف کے لیے استعمال نہ کرتے تو بہت اچھا ہوتا' فراق گورکھ پوری اور اختر انصاری کی وفات کے بعد ان پر یہ "الزام" جو دراصل "جرم واقعہ" کی حیثیت رکھتا ہے زیادہ جلی ہو گیا ہے کہ وہ اپنی تعریف میں خود مضامین لکھا کرتے تھے' اور مختلف ناموں سے متعدد رسالوں میں چھپواتے تھے۔ اس کا رد عمل احمد ندیم قاسمی صاحب پر یوں ہوا کہ وہ اپنے اخباری کالموں میں اپنے اشعار اقتباس کرنے لگے۔ اس تناظر میں مصور بشیر موجد تو مجھے اس دنیا کا واقعی ایک عظیم درویش اور استغنا پسند مصور نظر آیا جو آج تک اپنی تصویروں کی نمائش پر آمادہ نہیں ہوئے بلکہ بقول اسلم کمال "وہ کوئی پینٹنگ یا مصورانہ خطاطی اپنے پریس میں پرنٹ کر کے رسالہ فنون یا اوراق میں لگا دیتا ہے"۔ (اس جملے میں بھی ایک تیر موجود ہے جس کی نوک دل میں چبھ جاتی ہے)

میرے محترم اسلم کمال نے اس عہد کی اخلاقی بربادی پر کارٹونسٹ انور کے ایک کارٹون کا اقتباس یوں کیا ہے۔

"ایک شخص کو دوسرا شخص زبردستی گھسیٹتا ہوا بلڈنگ کی طرف لے جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے :

___ "میں اپنے دوست کے خون کا عطیہ دینے جا رہا ہوں"۔

اسلم کمال نے کسی دوست کے خون کا عطیہ پیش کرنے کی بجائے خود اپنے فن کی قربانی دے دی ہے اور یہ مقالہ ان کی عظمت میں اضافہ نہیں کرتا۔ اس تناظر میں سلیمہ ہاشمی کی کتاب "پاکستان میں بصری فنون کے پچاس سال" پر دوسروں کے حوالے سے ان کی مندرجہ ذیل تحریر بڑی معنی خیز ہے :

"کچھ لوگوں نے کلمہ شکر ادا کیا ہے کہ سلیمہ پرنسپل بننے کے بعد ہی سہی مصورہ اور نقاد بھی بن گئی ہیں۔ اس کتاب کے معترضین کے مطابق سلیمہ ہاشمی کو اپنے حلقہ احباب کے باہر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ کیا وہ داخلیت پسند ہیں؟ اس پر ایک صاحب نے برجستہ کہا کہ اپنے حلقہ احباب کے باہر سلیمہ ہاشمی کو اپنا آپ کہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ وہ خارجیت پسند کیسے ہو سکتی ہیں؟"

اسلم کمال نے یہ معرکہ آراء مضمون بڑی "ریاضیاتی دانشمندی" سے لکھا ہے۔ فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی طرح اس شہر کی شاہراہوں کے سنگم پر وہ خود ایستادہ صدر ایوب خان کی طرح بہت بڑے نظر آتے ہیں' یہ مضمون پچاس برس کی ادبی مصوری کے بارے میں ہے جس میں پاکستان کے دوسرے تمام مصوروں کے نام برائے وزن بیت ہی لیے گئے ہیں۔ اسلم کمال نے خود اپنی ذات گرامی کو قطبی ستارہ ثابت کیا ہے۔ مشرقی معاشرے میں جہاں تعلی کو گناہ سمجھا جاتا ہے اور انکسار اور استغناء کو بہترین قدر کی حیثیت حاصل ہے' یہ مضمون متعدد زاویوں سے "انوکھا" نظر آتا ہے۔ اس مضمون سے صرف بشیر موجد کا کردار قابل عزت نظر آتا ہے۔

مقالہ "حسرت موہانی کی غزل ____ جدید غزل کا ماڈل" اس لیے اہم ہے کہ اسے ایک ترک نژاد خاتون محترمہ ڈاکٹر سلمٰی بنیلی نے لکھا ہے۔ "تخلیق" میں مصنفہ کا تعارف نہیں کرایا گیا (مناسب ہوتا کہ اظہر جاوید پاورق میں مختصر تعارف کرا دیتے) لیکن اخبار "ڈان" میں ترکی میں مقیم ڈاکٹر انوار احمد کے ایک مکتوب سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سلمٰی بنیلی اورنٹیل کالج لاہور میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی شاگرد رہ چکی ہیں' انہیں اردو زبان پر پورا عبور ہے اور وہ اس زبان کے ادب کی گہری آشنا ہیں' اس مضمون کا اسلوب کلاسیکی ہے۔ ان کی رائے میں:

"حسرت کی بدولت غزل میں جذبات ایک نئے انداز میں سامنے آئے____ ان کے سبب عشق و محبت کے جذبوں کو تیقن نصیب ہوا جو اخلاص کے بغیر ممکن نہیں تھا____ ان کے ہم عصروں میں سے بیشتر نے نظم میں طبع آزمائی کی۔ اگر غزل کی طرف آئے بھی تو روایتی غزل کہنے سے آگے نہ بڑھ سکے' چنانچہ نظم طباطبائی' سرور جہان آبادی' تلوک چند محروم' مولانا ظفر علی خان' غلام بھیک نیرنگ' خوشی محمد ناظر' عظمت اللہ خان سب نے نظم پر زیادہ توجہ دی' لیکن حسرت نے غزل کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس میں حسن اور نکھار پیدا کیا' ان کی غزل سے ایک نیا اور تازہ تاثر ابھرا جو قدیم غزل میں موجود نہیں"۔

ڈاکٹر سلمٰی بنیلی کے زاویہ نظر میں جو خلوص نظر آتا ہے وہ ایک اکتسابی زبان سے ان کی محبت نے پیدا کیا ہے اور بے حد فطری محسوس ہوتا ہے۔ آیئے ڈاکٹر سلمٰی بنیلی کو اس مضمون پر مبارک باد پیش کریں۔ یہ ترکی کی طرف سے پاکستان کو تحفہ اخلاص ہے۔

شمہ رضوی نے تخلیق 1997ء میں پریم چند کی کہانی "روشنی" کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ "روشنی" پریم چند کے آخری دور کی کہانیوں میں شامل ہے لیکن یہ ان کی نمائندہ کہانی نہیں ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ پریم چند کے افسانے "کفن" نے ان کی بیشتر سابقہ کہانیوں پر دھند سی بکھیر دی ہے۔ "روشنی" میں ان کا مخصوص اصلاحی زاویہ نمایاں ہے' شمہ

رضوی نے یہ اصلاحی رویے کرداروں کے عمل سے دریافت کیے ہیں اور اس دور کی معاشرتی جزرومد کو بھی بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے تاہم افسانے کا فن اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ یہ کہانی پچکلنہ سی نظر آتی ہے اور اسے صرف تاریخی تناظر میں ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ شمیم رضوی سے اس معاملے میں اختلاف ممکن نہیں۔

"عموماً" کردار کے لہجہ پر پریم چند نے بہت زور دیا ہے۔ اس (کہانی کی) پہاڑی عورت کے لہجہ میں سادگی ضرور ہے لیکن پہاڑی لہجہ کی جھلک نہیں ہے۔ اس بے توجہی کے باوجود یہ کہانی (روشنی) اپنے مقصد کے اعتبار سے پریم چند کی کامیاب کہانیوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے"۔

رعایتی طور پر یہ کہانی ایک مخصوص دور کے فن کی نمائندہ بھی قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ دور "کفن" کی تخلیق کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔

اسلام عشرت کا مقالہ "ادیب کی سماجی ذمہ داریاں" نظریاتی نوعیت کا ہے۔ اس میں پہلے "ادب اور زندگی" ___ "ادب کا مقصد" اور "ادب و سماج" جیسے متعلقہ زاویوں کو زیر بحث لایا گیا ہے اور آخر میں یہ فیصلہ دیا گیا ہے کہ

"ادیب کی تحریریں ایک بہتر سماج کی تشکیل میں مدد دیتی ہیں---- ایک ادیب اپنی تخلیقات کے ذریعے آنے والی نسلوں کی زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے---- ایک ادیب سارے سماج اور ملک میں انقلاب برپا کر سکتا ہے"۔

اسلام عشرت صاحب کو یہ سب باتیں یاد دلانے کی ضرورت شاید اس لیے پیش آئی کیونکہ اس عہد کا ادیب اپنی تمام سماجی ذمہ داریوں سے غافل ہو چکا ہے اور صرف "تن کی دنیا" میں زندگی بسر کر رہا ہے جو "سود و سودا بھی ہے اور مکر و فن بھی" ___ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانا اب اس کا مقصد اولیٰ نہیں رہا۔ اسلام عشرت صاحب نے اس دور کے مشینی انسان پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"انسانیت کراہ رہی ہے اور انسان عصر حاضر کے مشین اور کمپیوٹر دور میں محض ایک مشین یا کمپیوٹر بن کر رہ گیا ہے۔ اخلاق، محبت، خلوص، ایمان، صداقت، شجاعت اور عدالت کا اب نام و نشان تک نہیں ہے"۔

اس قعر زوال میں ادیب بھی اپنے منصب سے گر چکا ہے اور اب گردن ڈالے اسٹیبلشمنٹ سے مراعات، انعامات، پلاٹ، عہدہ، منصب اور رعایات حاصل کرنے کی دوڑ میں شامل ہے۔ اسلام عشرت نے اچھے انسان کی جو خصوصیات گنوائی ہیں، جب آج کا ادیب ان سے سرفراز ہو گا تو وہ اپنی ذمہ داریاں بھی ضرور پوری کرے گا۔ فی الحال ادب کی تخلیق سے اس کا کوئی اجتماعی بہبودی مقصد وابستہ نہیں، فروغ ذات اور نمائش تخلیق ہی اس کی پسندیدہ قدر ہے جو تمام فنون لطیفہ میں کثرت سے پھیل چکی ہے۔ اسلام عشرت نے ادبی معاشرے کی تجرید تو پیش کر دی ہے لیکن اس کے داغ نمایاں نہیں کیے۔ حالانکہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو اجاگر کیا جائے۔ جس معاشرے کا ادیب اخلاقی اور تمدنی معیار سے گر جاتا ہے وہ معاشرہ بھی اس کے ساتھ ہی منہدم ہو جاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اگر کبھی روبہ اصلاح ہوا تو اس کی پہلی کرن ادیبوں کے طبقے سے بیدار ہو گی۔ کاش! ہمارے عمر رسیدہ، خزاں گزیدہ اور

قبر رسیدہ ادبائے کرام رزق زمین بننے سے پہلے یہ فریضہ ادا کر جائیں اور بیرونی ممالک کی "مشاعرہ بازی" میں زیادہ وقت ضائع نہ کریں۔ اسلام عشرت کا مقالہ بالواسطہ طور پر اس پیغام کا ہی نقیب ہے۔

"تخلیق" کے چند ٹھوس اور پر مغز مقالات کا تذکرہ یہاں ختم ہوتا ہے' اظہر جاوید نے ایک اہتمام یہ بھی کر رکھا ہے کہ وہ ہلکے پھلکے تاثراتی تنقیدی مضامین کو جن میں مصنف اور تصنیف دونوں زیر بحث آ جاتے ہیں' ایک نئے عنوان "جائزے" کے تحت پیش کر دیئے ہیں۔ اس برس "تخلیق" کے اس حصے میں نارنگ ساقی نے محترمہ سحاب قزلباش اور ان کی تصنیف "میرا کوئی ماضی نہیں" اور ڈاکٹر کیول دھیر کی افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کیا۔ سحاب قزلباش نے بقول نارنگ ساقی اپنی اس کتاب میں ماضی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہی ہیں اور وہ ماضی کی یادوں میں شرابور ہیں' انہوں نے مشفق خواجہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "سحاب نے اپنے گزرے ہوئے لمحوں کو از سر نو گزارنے کی کوشش کی ہے"۔ نارنگ ساقی کا مندرجہ ذیل اقتباس بے حد معنی خیز ہے۔

> "سحاب قزلباش نے یہ کتاب سچ مچ خون دل میں انگلیاں ڈال کر لکھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں لہو ان کا نہیں بلکہ میرا جی اور ن۔ م۔ راشد کے رومانوں کا ہے۔ شروع میں سحاب کی جوانی کی تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ن۔ م۔ راشد' مخمور جالندھری' اور میرا جی وغیرہ صرف اس کی شاعری کے مداح نہیں ہوں گے' بلکہ اس کی خوبصورتی کے اسیر بھی ہوں گے"

نارنگ ساقی نے "کہانیوں کا مسیحا" میں ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت کے ظاہر اور افسانے کے باطن سے دریافت کیا ہے اور ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جس کے ظاہر اور باطن میں کوئی تضاد اور بعد نہیں ہے۔ اور اہم بات یہ کہ ان کے پیشے اور ادب میں بھی ہم آہنگی موجود ہے۔

طاہر مسعود نے اپنے مضمون "مختصر نظم کا بانی" میں ایک بھولی بسری شخصیت' عظیم قریشی کو یاد کیا ہے اور اس تاثر کا جائزہ لیا ہے جسے عظیم قریشی خنداں' شاداں اور لرزاں رکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ الفاظ لکھتے ہوئے ایک پرانی سی ٹوپی' کمانی والی عینک اور ملگجی سفید مونچھوں کے اوپر حیران آنکھیں رکھنے والا عظیم قریشی مجھے بہت یاد آ رہا ہے۔ بلاشبہ وہ ادب کے ساتھ مخلص اور مدیران رسائل کا نیاز مند تھا۔ لیکن اب وہ ایک بھولی بسری یاد ہے۔ اس کے بارے میں طاہر مسعود کی رائے یہ ہے:

> "عظیم قریشی اس صدی کی ایک نمایاں ادبی شخصیت اور اردو ادب کی روایت میں میرا جی کے تحت چلنے والی اشاریت' ابہام اور داخلیت پسندی کے فکری سلسلے کی ایک ایسی وقیع کڑی ہیں' جن کے حوالے کے بغیر اردو ادب بالعموم اور اردو نظم کی تاریخ بالخصوص مکمل نہیں ہو سکتی"۔

کیول سوری نے "عشق' انا' مخمور" میں اس شاعر کو نکھارا ہے جس نے لکھا تھا کہ:

> "عملی زندگی میں اکثر میں نے خسارے کے سودے کیے ہیں۔ لیکن ان پر کبھی پچھتایا نہیں"

خساروں کا یہ سوداگر مخمور سعیدی ہے۔ کیول سوری کا یہ جائزہ مخمور سعیدی سے زیادہ ان کی کتاب "دیوار و در

کے درمیان" کو موضوع بناتا ہے لیکن اس کینوس پر بیشتر نقوش مخمور سعیدی کی شخصیت کے ابھرے ہیں۔ یہ مخمور سعیدی کسی شیریں کی ابرو کے اشارے پر تیشہ اٹھا کر' بے ستون کا جگر چیرنے کے لیے تو نکل سکتا ہے لیکن شرط یہ ہو گی کہ اس کی محبوبہ کی پلکیں بھی اس کے تصور سے بوجھل رہیں۔ کیول سوری نے اس انا کو "دھنک رنگ" قرار دیا ہے۔ یہ مقالہ کیول سوری کی کشادہ نظری کو عیاں کرتا اور اس آئینے میں ہمیں مخمور سعیدی کی کئی منور تصویریں دکھاتا ہے جو اس کے شعروں سے بھی منعکس ہوتی ہیں۔

تخلیق میں اس برس ایک جائزہ شمع خالد نے بھی مرتب کیا ہے۔ انہوں نے شمس نعمان کو ان کے افسانوں سے دریافت کیا ہے جو نسبتاً زیادہ مشکل کام تھا۔ بظاہر وہ یہ فیصلہ تو نہیں کر پائیں کہ شمس نعمان بڑا افسانہ نگار ہے یا بڑا انسان لیکن ان کے اس جائزے میں چند اچھے افسانوں کا تذکرہ اس طرح سما گیا ہے کہ شمس نعمان بڑا افسانہ نگار ثابت ہو جاتا ہے اور وہ بڑا انسان بھی نظر آتا ہے۔ احساسات کی بے کرانی کے اس افسانہ نگار کا رابطہ جن لوگوں سے ہوا ہے وہ سب اس بات کی شہادت دیں گے کہ اس نامخلص دور میں شمس نعمان اس کنول کی طرح ہے جو تالاب میں رہنے کے باوجود اپنے پروں کو آلودہ نہیں ہونے دیتا----" وہ خود کو درویش کہتا ہے اور واقعی درویش ہے۔ لیکن اس کے قلم میں کیمرے کی طاقت ہے----" شمع خالد! آپ نے یہ بات سو فی صد سچ لکھی ہے۔

عارف ثاقب نے "نئے پرانے مضامین" کے جائزے میں تنقید کے ایک درویش صفت' ادیب عبدالکریم خالد کی پہلی کتاب کا تعارف کرایا ہے۔ عارف ثاقب کے مضمون کے مطالعے سے پہلے میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی تھی لیکن اب پڑھ لی ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ عارف ثاقب نے عبدالکریم خالد کے بعض نادر تنقیدی گوشوں کو بڑی معنویت سے پیش کیا ہے۔ مجھے ان کی یہ بات اچھی لگی کہ عبدالکریم خالد اس دور کے بعض نامور ادیبوں کی ٹوپیوں میں نئے پھندنے لگانے اور ان کی انا کو تسکین دینے کی بجائے ان ادیبوں کو متعارف کرانے میں گہری دلچسپی لیتے ہیں' جنہیں آج کا "کریٹ نقاد" نظر انداز کر دیتا ہے۔ عارف ثاقب نے اس جائزے میں احمد عقیل روبی' فرخندہ لودھی' ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی اور سجاد باقر رضوی پر مضامین کا خصوصی ذکر کیا ہے' اور ان کی تنقید سے عبدالکریم خالد کا منشور تنقید بھی دریافت کیا ہے۔ ادبی جائزے لکھنے والوں اور تخلیق کاروں کو بڑی تقویت دیتے ہیں' مجھے خوشی ہے کہ یہ صلاحیت عبدالکریم خالد میں موجود ہے اور اس کی عملی صورت' ان کی کتاب میں بھی نمایاں ہے؟ میں انہیں یہ صلاحیت مزید پروان چڑھانے کا مشورہ دیتا ہوں۔

درویش صفت شعراء میں فراز صدیقی بھی شامل ہونے کے فطری حق دار ہے۔ فراز صدیقی نے بھی تخلیق کا چراغ شہرتیں عطا کرنے والے تکیوں اور جاگیردار مدیروں کی محفلوں سے دور ایک ویرانے میں روشن کر رکھا ہے۔ وہ اسے مسلسل خون جگر سے روشنی عطا کر رہے ہیں۔ ان کی کتاب "رگ ساز سحر" پر یہ جائزہ شاعر کے علاوہ معاشرے کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ اخلاق عاطف نے فراز صدیقی کو "شہر" کے استعارے سے دریافت کیا اور اس استعارے کو پورے معاشرے پر پھیلا دیا ہے۔

"جگنو ہنستے ہیں" میں شبہ طراز نے اپنی شاعری کے جگنو پیش کیے ہیں' قیصر تمکین نے یہ جگنو کسی اندھیری رات

میں جمع کیے اور اپنے اس جائزے میں ایک نئی کہکشاں مرتب کر دی۔ ہائیکو اور ماہیا کی اس کتاب کی انفرادیت یہ قائم کی گئی ہے کہ اس میں شبہ طراز نے "موتیا' کچے آم' سرسوں' کنویں کے پانی' چوپال اور پنگھٹ کو ہائیکو میں جرات آمیز اپنائیت سے نوازا ہے--- اور اردو ہائیکو میں اردو کی تہذیب' وضعداری اور رمز شناسی سے کام لیا ہے" شبہ طراز کو یہ رائے اس خطہ زمین سے حاصل ہوئی جہاں سچ کا اظہار قدر اول کی حیثیت رکھتا ہے' اس لیے وہ قیصر تمکین کے اس جائزے پر بجاطور پر فخر کا اظہار کر سکتی ہیں کہ یہ منافقت کی توصیف سے عاری جائزہ ہے۔

یہاں خصوصی مطالعے کے تحت لالی چودھری کے افسانوں پر ڈاکٹر محمد عالم خان کے جائزے کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لالی چودھری اگرچہ پاکستان نژاد ہیں لیکن وہ عرصے سے امریکہ میں آباد ہیں' ان کے افسانوں میں تارکین وطن کے مسائل کا خصوصی تذکرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم خان نے ان کے افسانوں سے رومانوی حسن' سادگی اور سلاست دریافت کی ہے اور مستقبل میں ان سے درخشاں توقعات وابستہ کی ہیں۔

1998ء کا آخری جائزہ رفاقت علی شاہد نے لکھا ہے جو اتفاق سے اس ناچیز کی ایک کتاب کے بارے میں ہے۔ عنوان "ادبی تاریخ نگاری کا اہم سنگ میل" ہے--- اور یہ اتنا چکا چوند عنوان ہے کہ میں فی الحال اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ مجھے اس بات کا قطعاً علم نہیں کہ "اردو ادب کی مختصر تاریخ" کا کیا مرتبہ اور کیا مقام ہے؟ میرا اعزاز یہ ہے کہ اس پر ڈاکٹر گیان چند جین نے تبصرہ لکھا اور اس کی بعض فروگزاشتوں اور خامیوں کی طرف متوجہ کرایا۔ رفاقت علی شاہد کا جائزہ مدلل مداحی کی زد میں لیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ مجھے اس کتاب پر غالب دوراں شاعر شب نگار بنداں حضرت جمیل یوسف کی رائے بھی عزیز ہے جو انہوں نے دو برس پہلے لکھی تھی' اس میں ان کی "دوست نوازی" کا "انداز دیگر" بھی موجود تھا اور وہ اب تک اسی مقام پر کھڑے رسی کو پیٹ رہے ہیں۔

اس برس مجھے یہ اعزاز اظہر جاوید نے عطا کیا کہ 1997ء کے جائزے کو پورے سال کی اقساط میں پھیلا دیا۔ میں 1997ء کے دوران "تخلیق" کے گھمسان میں موجود رہا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ لالی چودھری کے افسانوں پر میرے مضمون کو اظہر جاوید نے پسند کیا اور اس کی بے پایاں داد خود لالی چودھری نے دی۔ بلاشبہ یہ میرا 1998ء کا "پرائڈ آف پرفارمنس" ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ تخلیق میں "تنقید 1998ء" کا جائزہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

یار زندہ صحبت باقی----

"لفظوں کا شہر" اور "تری صدا آئی"
کے بعد مقبول شاعرہ
صبیحہ صبا کا تیسرا مجموعہ کلام
لفظ بنے تصویر
چھپ گیا ہے۔

ردِّ عمل

کیول سوری (بھارت)

چندر بھان خیال نے جب مجھے اپنی شاعری پر اظہار خیال کرنے کے لئے کہا تو میں نے فوراً حامی بھرلی لیکن یہ خیال خاطر احباب والی رسمی بات نہیں ہے' مجھے واقعی اس کی ہر خواہش عزیز ہوتی ہے۔ کیوں ہوتی ہے اس کا علم مجھے بھی نہیں۔ بہرحال حامی تو بھرلی لیکن جب لکھنے بیٹھا تو یوں لگا کہ اس نے یہ فرمائش محض مجھے آزمائش میں ڈالنے کے لئے کی ہے۔ کیونکہ اس کے پہلے شعری مجموعے "شعلوں کا شجر" اور دوسرے "گم شدہ آدمی کا انتظار" پر بہت سے قدآور صاحب نظر اور ناقد اپنے تاثرات کا اظہار کر چکے ہیں اور وہ بھی مختصر طور پر نہیں' تفصیلی جائزے کی شکل میں۔ اب اگر میں کچھ کہنے کی کوشش کروں گا تو نتیجہ ظاہر ہے۔ ہر بات پر یہ کہا جائے گا کہ یہ بات تو فلاں صاحب بھی کہہ چکے ہیں۔ لہٰذا میرے لئے صرف ایک ہی راستہ بچا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے یا اس کی تائید کروں یا اختلاف کی وجہ بتاؤں۔ اس پر یہ اعتراض ہو گا کہ اگر کوئی نیا زاویہ نہیں تھا تو خاموش رہتے۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے خیال کی ہر خواہش عزیز ہوتی ہے۔

خیال کی شاعری پر جو مضامین یا تاثرات میری نظر سے گزرے ہیں' انہیں پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر نگارشات روا روی اور سرسری رویے کی پیداوار ہیں۔ بلکہ کچھ تو مسخرے پن کی حد کو چھوتی ہیں۔ مثلاً مائی ڈیئر (جو پچھلے تیس برس سے میرے لئے مائی ڈیئر رہے ہیں۔ اس کے باوجود.....) زبیر رضوی کے افکار عالیہ جو گم شدہ آدمی کا انتظار' کے فلیپ پر شائع ہوئے ہیں اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا کہ ترتیب کے اعتبار سے پروفیسر عتیق اللہ پہلے آتے ہیں جن کا دیباچہ اس شعری مجموعہ میں شامل ہے اور جس کا عنوان اور کچھ باتیں مجھے چونکانے کا باعث بنی ہیں۔ عنوان ہے "احتجاج کا منفرد شاعر" مجھے لفظ "منفرد" نے نہیں چونکایا کہ اردو کا ہر صاحب کتاب شاعر یا افسانہ نگار "ابھرتا ہوا" یا "منفرد" رہا ہے۔ یہ قصہ آج کا نہیں' برسوں پرانا ہے۔ میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا چندر بھان خیال کے بارے میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ احتجاج کا شاعر ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

> "..... اس کے احتجاج یا باغیانہ رویے میں ایک طرح کا نوجوانانہ خروش پایا جاتا ہے اس طرح وہ ترقی پسندوں سے زیادہ برافروختہ نسل کا نمائندہ نظر آتا ہے....."

(میرے خیال میں ترقی پسندوں میں زیادہ برافروختہ شاعر وہ مانے جاتے تھے جن کی شاعری کی اساس گلا پھاڑ

کھوکھلی نعرہ بازی تھی۔ لیکن یہاں اس پر بحث بر محل نہیں ہو گی۔) معذرت خواہ ہوں کہ خیال کی بعض نظمیں پڑھ کر مجھے Impotent rage کا احساس تو ہوتا ہے' برافروختہ احتجاج کا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال نے شاعری کسی پلیٹ فارم کے لئے نہیں کی بلکہ وہ تو زندگی کی ان جان لیوا سچائیوں کا احاطہ کرتا ہے جو اس کی سوچ کو شب و روز سنگسار کرتی ہیں' لیکن وہ حالات کو بدلنے کے سلسلے میں کچھ کر نہیں پاتا۔ کچھ نہ کر پانے کے غم سے بے بسی کا خمیر اٹھا ہے اور بے بسی کی کوکھ سے Impotent rage جنم لیتی ہے۔ احتجاج' برافرختگی' اور صاحب اقتدار کا سماجی یا اقتصادی ڈھانچا توڑنے کی باتیں وہ نقلی ریوالور ہیں جن سے آج کل کے سنیما اور ٹی وی کے شائق بچے اپنے والدین کو ڈراتے ہیں۔ میرے لئے یہ بات باعث تسکین ہے کہ خیال کی شاعری ماورائی نہیں ہے' اس کا رشتہ زمین سے ہی نہیں پاتال تک سے ہے۔ مثال کے طور پر اس کی نظم "سازش' بھیڑ اور پتھر" کو لیجئے۔

دے نہیں سکتا شفا روگی کو مہمل احتجاج
اور بڑھ جاتی ہے بے چینی' بگڑتا ہے مزاج
ایک بازو نوچتا ہے دوسرے بازو کا گوشت
جسم بن جاتا ہے مہلک خواہشوں کی عیش گاہ
بند دروازے کے باہر اک سکوت بے پناہ
کھلکھلا اٹھتا ہے جب بازار ہوتے ہیں تباہ
اور اپنی درسیوں کے درمیان بیٹھا ہوا
بستیوں کا دیوتا کرتا ہے خود کو بے لباس

اس اندوہناک استحصال بالجبر سے برافروختگی نہیں' خوف کے باب کھلتے ہیں۔ خیال کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

امن کی دیوی پریشاں' فکر کے چہرے اداس
خوف نے ڈالا ہے ڈیرا شہر دل کے آس پاس
چھٹپٹاتے ہیں پرندے گھونسلوں میں رات دن
ہے یونہی شاخ شجر پر زندگی کا اہتمام

اس میں احتجاج کہاں ہے؟ غصہ کہاں ہے؟ ہاں' ہمارے عہد کی دردناک سچائیوں کا اظہار ضرور ہے"۔ ایک بازو نوچتا ہے دوسرے بازو کا گوشت" یہ تو قہر درویش بر جان درویش' والی کیفیت ہے' احتجاج نہیں۔

یا پھر اس کی نظم "لمحوں کا حصار" کے اختتامیہ مصرعے:-

"ہتھیلی پر پھدکتا ہے
کسی بے پر پرندے کی طرح جسموں کا مستقبل
کہاں پائے سکون دل

کہ اب راتوں کے صحراؤں کا ہر سیاح زخمی ہے
دہکتی سرخ اینٹوں پر
کسی پیاسے نے اپنی لپلپاتی جیبھ رکھ دی ہے

جب وہ دیکھتا ہے کہ ہوس کے محل ویران ہو کر بھی جگمگاتے ہیں' عیاشیوں کی قتل گاہوں پر مجبور' برہنہ جسم موت کا رقص کرتے ہیں تو وہ کسی بے بس مگر چشم دید گواہ کی طرح صرف وہی کہتا ہے جو اس نے دیکھا ہے' محسوس کیا ہے۔ اور پھر احتجاج نہیں Surrender کرتا ہے۔

وہ جو پتھر بن کے برسوں سے تھا سینے پر سوار
آج اس نے بھیڑ کے ہاتھوں میں پتھر دے دیا

احتجاج' برافروختگی یا ردعمل سے پیدا ہونے والے نتائج کی خوش فہمیاں اسے خیالی' ماورائی جزیروں کی جھلک دکھانے سے قاصر رہی ہیں۔ اس کا اعتراف وہ اپنی نظم "ازل تا ابد" کے اختتامیہ مصرعوں میں کرتا ہے:-

"اذیت ناک لمحوں کا
تسلسل توڑنے جب بھی نکلتا ہے
وہ سینہ تان کر اپنا
اسے کوئی نہ کوئی راستے میں ٹوک دیتا ہے
وہ خود رکتا نہیں لیکن
خزانہ روک دیتا ہے
جو اس کو مل نہیں پاتا
کہ اس کے سرد اور کالے مقدر میں
فصیلیں کہنیوں سے ٹھونکتے رہنا ہی لکھا ہے"۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' چندر بھان خیال کی شاعری خوابوں کے حسین مرغزاروں میں چہل قدمی کرنے کی بجائے زندگی کی سنگلاخ چٹانوں سے سر پھوڑتی ہے' لہولہان ہوتی ہے۔ میرے خیال میں کھری اور سچی شاعری کی یہی پہچان ہے۔

زبیر رضوی کے فلیپ متن کا اقتباس پیش خدمت ہے:-

تیرگی نے ڈال دی ہے پاؤں میں زنجیر میرے
میں کہ اپنے جسم کے اندر لرزتا کانپتا ہوں
ڈھونڈتا ہوں
کوئی دروازہ' کوئی کھڑکی' کوئی روزن
نکل آئے کہیں سے۔

زندگی کے اندھیرے میں کسی دریچے یا روزن کے کھلنے کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عمل یہ بھی ہے کہ دیوار پر جمے پلستر کو ناخنوں سے کھرچ کر روشنی کے لیے سوراخ کر لیا جائے۔ ایسے ہی روزنوں سے دیواروں کے بیچ منہ بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ خیال کے یہاں دیوار میں روزن کی تلاش ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی طرح بڑی شدید ہے۔ فرخ زاد کی کئی نظموں میں روزن کا استعارہ باطن کے ساتھ خارج کے ربط کی استواری کا استعارہ ہے۔ وہ کہتی ہے " جب تم انتظار اور اقرار کے موعودہ موسم میں میرے پاس آؤ تو اپنے ساتھ ایک دریچہ بھی لانا کہ میرے گھر کی دیواروں میں کوئی دریچہ نہیں ہے۔ خیال کے یہاں یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہے کہ روزن کھڑکی یا دروازہ' زندگی کے حبس' گھٹن اور تیرگی سے نجات کا وسیلہ تو ہے ہی' وہ تازہ ہواؤں کا لمس بھی عطا کرتا ہے------"

اس سلسلے میں ایک بات تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مندرجہ بالا عبارت چونکہ "گمشدہ آدمی کا انتظار" کے فلیپ پر ہے' قاری کو یہ گمان ہوتا ہے کہ خیال کے وہ مصرعے جن کا حوالہ دیا گیا ہے' اس مجموعے میں شامل ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے--- یہ مصرعے خیال کی نظم "ڈریگن کے پروں پر" سے لئے گئے ہیں جو اس کے پہلے شعری مجموعہ "شعلوں کا شجر" میں شامل ہے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چندر بھان خیال کے دوسرے مجموعے میں زبیر رضوی کو کوئی شعر یا مصرع قابل اعتنا نہیں لگا۔ اگر یوں ہے تو حیران ہونے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔ اسے بھی چھوڑیئے' چلئے دیکھتے ہیں کہ ان مصرعوں کی یا اس نظم کی' جس کے یہ مصرعے ہیں' ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی شاعری (وہ جس کا حوالہ زبیر صاحب نے دیا ہے) سے کیا مماثلت ہے اور ان مصرعوں کی اس سیاق و سباق میں کیا Relevance ہے۔ خیال کی نظم کا خلاصہ یوں ہے :-

میں ڈریگن کے پروں پر انجانے سفر میں ہوں۔ اچانک اک انوکھے ساز کی جھنکار سن کر میں چونک اٹھا ہوں کہ اس بیکراں خلاء میں یہ آواز کیسی؟ میری آمد کی کس کو خبر تھی۔ پھر ڈریگن مجھے اس جزیرے کی طرف لے جاتا ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس کے پتھروں یا گوہروں کے ڈھیر پر ایک ننگی عورت کھڑی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سپنا ہے یا حقیقت۔ خواہشوں کا ناگ پھن اٹھائے کھڑا ہے۔ میں اس طرح چھٹپٹاتا ہوں جیسے کوئی وشدھر زہر اگلنے کے لئے سر پھوڑتا ہے۔ اس لپلپاتی آگ میں مجھے اپنے بچوں کے معصوم چہرے اور اپنی بیوی کا دہکتا پاک جوبن بھی دکھائی دیتا ہے۔ مجھ پر لرزہ خیز خوف طاری ہے اور میں حصار جسم سے نکلنا چاہتا ہوں لیکن نیچے اندھیرا غار ہے اور ڈریگن چیخ کر کہتا ہے کہ اب تمہیں پربتوں کے بیچ اس جنگل میں جانا ہی ہو گا جہاں جنگلوں کی شاہزادی یعنی وہ عورت جو ہر جنگل میں شاہی حکم بن کر گونجتی ہے اور جس کے جسم کی جادوگری جادوگروں کو بھی زیر کر لیتی ہے' تمہاری منتظر ہے کہ اب نہ تو بیوی بچوں کا تصور ہے' نہ کوئی اور خواہش کہ اب میں اپنی ریڑھ کی ہڈی سے بھی محروم ہو چکا ہوں۔ اس خلائے بیکراں میں اب میں منظر موہوم ہو گیا ہوں۔

یہ ایک سیدھی سادی بیانیہ نظم ہے جس میں جنسی ناآسودگی سے پیدا ہونے والی خواہشوں کے ان جنگلوں تک پہنچنے کی تمنا کا بڑا پر اثر اظہار ہے' جہاں جسم راگ سننے میں کوئی ممانعت نہ ہو اور اس کا دہکتا ہوا بدن جنسی آسودگی کی برکھا سے سرشار ہو سکے لیکن چونکہ شاعر کوئی فلمی ہیرو نہیں ہے' گوشت پوست کا عام اور کمزور سا آدمی ہے' سماجی

بندھن اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ اور یہ زنجیر اسے شہوت کے پرکیف سبزہ زاروں سے کھینچ کر حقیقتوں کی چٹانوں کی طرف لانے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی ہے۔ اس ذہنی کشمکش کا فطری اور ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد گہری تاریکیوں کے خیمے تن جاتے ہیں اور وہ ذہنی اور جسمانی توانائی کھو بیٹھتا ہے۔

زبیر صاحب کی یہ سطر میں پھر دہراتا ہوں۔ "خیال کے یہاں دیوار میں روزن کی تلاش ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی طرح بڑی شدید ہے"۔ ایرانی شاعرہ نے تو روزن کا نہیں دریچہ کا ذکر کیا ہے۔ قطع نظر اس کے آپ کو ان دو شاعروں میں کوئی مماثلت محسوس ہوئی سوا اس کے کہ دونوں (بقول زبیر رضوی) لفظ روزن کا استعمال کرتے ہیں۔ " ڈریگن کے پروں پر" پڑھتے ہوئے ایرانی شاعرہ کی طرف توجہ جانے کا کیا جواز ہے؟ روزن؟ تحقیق کی اس سے زیادہ معراج اور کیا ہو سکتی ہے۔ بدقسمتی سے مماثلت کا وہ پہلو بھی صحیح نہیں ہے جس کی "دریافت" زبیر رضوی کے زرخیز ذہن کا عطیہ ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' فرخ زاد اپنے محبوب سے روزن کی نہیں' دریچہ یعنی کھڑکی کی فرمائش کرتی ہے جس کی چوکھٹ پر ٹھوڑی جما کر وہ ان ریگزاروں پر آنکھیں بچھا سکے جن سے اس کے محبوب کے آنے کی توقع ہو۔ دریچہ کے نہ ہونے سے انتظار کا کرب کہیں زیادہ وحشت ناک ہو جاتا ہے۔

زبیر رضوی شاید روزن اور دریچہ کو مترادفات سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بہرحال یہ رویہ میرے لئے قابل قبول نہیں ہے کہ موقع محل ہو یا نہ ہو' کوئی ایسی بات ضرور کہی جائے جس سے ظاہر ہو کہ صاحب مضمون کی نہ صرف فارسی پر دسترس ہے بلکہ ان کا ایرانی شاعری سے شناسائی بھی ہے۔

"شعلوں کا شجر" کے دیباچے میں کمار پاشی نے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ "جدید شعراء نے معاشرے کے ساتھ ساتھ فرد کی اہمیت پر زور دیا تھا جب کہ خیال کے یہاں معاملہ بالکل الٹ ہے۔ ان کے نزدیک معاشرے کی اہمیت فرد کی اہمیت سے زیادہ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ان کے نزدیک فرد کا وجود اور اس کی پہچان معاشرے کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے"۔

نہ صرف "شعلوں کا شجر" بلکہ خیال کی اس کے بعد کی شاعری بھی اس کی بھرپور تائید کرتی ہے کہ معاشرے کی محرومیاں اور اس کے دکھ اس کے لئے نجی مسائل سے کہیں زیادہ پریشان کن ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اس کی نظم "سازش" ہے۔ اس کے کچھ بند ملاحظہ کیجئے:-

اور پھر آج ہوا یوں کہ سبھی ننگے بدن
گھر سے نکلے تو کسی کو بھی نہیں خواہش زن
صرف تنہائی سر شام گلی کوچوں میں
سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی طرح انکی ہے

دام خواہش سے اک آواز فغاں اٹھتی ہے
جسم کی آگ بھی پانی کی طرح ٹھنڈی ہے

ایک دیوانہ صفت شخص مگر پہروں تک
جا بجا جنس کے جنگل میں سفر کرتا ہے

یہ حقیقت کہ پورا معاشرہ نامرد ہو چکا ہے' شاعر کی ذہنی کوفت کا باعث بنتی ہے لیکن "جنس کے جنگل میں سفر کرنا" شہوانی خواہش کی تسکین نہیں بلکہ افزائش نسل کی تمنا ہے جو معاشرے کی بقا کی بشارت دے سکے۔ نظم کا ایک اور بند بھی بنجر دھرتی اور نامرد معاشرے کی منظر کشی کرتا ہے :-

کوئی منظر ہی نہیں آنکھ اٹھائیں کیسے
برف کے گھر میں بھلا آگ جلائیں کیسے
ہر شجر شاخ سے محروم' شکستہ' زخمی
کیسے رہ پائے نمک بار فضا میں زندہ

اور پھر نظم اس یقین اور اعتماد کے ساتھ ختم ہوتی ہے کہ کوئی بھی سازش اس دھرتی کو نہ بانجھ بنا سکتی ہے اور نہ نور سے محروم کر سکتی ہے کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ :-

ایک دیوانہ صفت شخص مگر با حکمت
کاٹتا ہو گا کہیں دور اندھیرے پربت
جس کے سینے میں سلگتے ہیں کئی آتش داں
جو نہ کاوش سے بجھیں گے نہ کسی سازش سے

اپنے ماحول اور گردوپیش میں صرف جبر اور استحصال ہی اس کے بلبلانے کا باعث نہیں بنتے' وہ تو اس معاملے میں اس قدر ذکی الحس واقع ہوا ہے کہ اگر اسے اپنے ارد گرد سناٹا بھی محسوس ہوتا ہے تو اسے یوں لگتا ہے جیسے یہ خود اس کی اپنی ڈوبتی ہوئی سانس کی خموشی ہو۔ اس کی نظم "تماشا" کے یہ چند مصرعے اس کی تائید کریں گے۔

ہوا اترا کے بہنا چاہتی ہے میرے پہلو میں
مگر آنگن کا سناٹا اسے بہنے نہیں دیتا
میں کہنا چاہتا ہوں کچھ مگر کہنے نہیں دیتا
یہ سناٹا مجھے بھی چین سے رہنے نہیں دیتا

دیکھئے' آنگن یعنی معاشرے کا سناٹا بھی اس کی ذاتی بے چینی اور پھڑپھڑاہٹ کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کیفیت کا اظہار اس کی نظم "شور شبستاں" میں یوں ہوا ہے :-

میری پسلی میں جما ہے کئی شہروں کا سکوت
جیسے سویا ہو کسی غار میں تہذیب کا بھوت
کو بہ کو کرب مہکتا ہے بدن سے اڑ کر
سمت در سمت بھٹکتی ہے نظر بے مقصد

یوں تو چندر بھان خیال کی ہر نظم اس کے وجود میں دہکتے ہوئے جوالا مکھی کا احساس دلاتی ہے لیکن اس کی نظم "گمشدہ آدمی کا انتظار" میں اس کی Tortareol Soul قاری کو بری طرح جھنجھوڑتی ہے :-

وہ سورج کا ساتھی اندھیروں کے بن میں
اثاثہ لئے فکر کا اپنے فن میں
شعاؤں کی سولی پہ زندہ ننگا ہے
نہ اب شہر میں کوئی اتنا حزیں ہے
غضب ناک تنہائیوں کو یقیں ہے
کہ اس کے مقدر میں وہ خود نہیں ہے

وہ اک انفرادی حقیقت کا حامی
فصیلوں پہ وہم و گماں کی کھڑا ہے

سحر زاد شبنم سے یہ پوچھتا ہے
کہ سورج کے سینے میں کیا کیا چھپا ہے

اور جب وہ سورج کے سینے میں چھپے جہنم کو بھوگ لیتا ہے تو اپنی ناگفتہ بہ حالت کا بیان یوں کرتا ہے :-

کسی دیوتا کی نگاہ غضب سے
بنا اجنبی اپنے آباد گھر میں
کبھی اس نگر میں کبھی اس نگر میں
کبھی بس گیا صرف دیوار و در میں
وہ اک شخص تنہا کہ جس کا ابھی تک
سفر ہے مسلسل، نہ گھر مستقل ہے

جو شہر انا میں کھڑا سوچتا ہے
کہاں رات کاٹے، کہاں دن بتائے

چندر بھان خیال کی شاعری کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ترقی پسندی اور جدیدیت سے متاثر ہوتی ہے۔ جہاں تک ترقی پسندوں کا تعلق ہے میرے خیال میں اس کی نوعیت سن بلوغت پر پہنچنے والے کچے ذہن کی سی ہے کہ اگر کوئی نوجوان اس عمر میں ترقی پسندوں کی سی حرکتیں نہیں کرتا تو اس کے والدین کو ڈاکٹر یا ماہر نفسیات سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن صرف سرسری معائنے سے اس کی تشخیص نہیں ہو سکتی کیونکہ Aids کی طرح اس کے آثار سامنے

آنے میں کئی برس لگ جاتے ہیں۔ لیکن خیال کی شاعری نے اتنا وقت نہیں لیا۔ اس نے اس سے بہت پہلے ہی ثابت کر دیا کہ وہ اس مرض میں مبتلا نہیں ہے۔ رہی بات جدیدیت کی تو اس کا ایک رویہ یہ بھی رہا ہے کہ کچھ ایسی بات کچھ ایسے انداز سے کی جائے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ یہ ایک سوچا سمجھا شعوری عمل ہوتا تھا۔ لیکن خیال کی شاعری میں یہ رویہ کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر اس کے یہاں کہیں ابہام ہے بھی تو اس کی وجہ اس کا اپنا کنفیوژن ہے' کرتب نہیں۔

ڈاکٹر انور سدید مائی ڈیئر زبیر رضوی جیسے ان نقادوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کتاب کو بغیر پڑھے (یا سمجھے) اس پر تبصرہ کر دیتے ہیں۔ تبھی وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خیال کی نظمیں پڑھتے ہوئے دھیان بے اختیار منیر نیازی کی طرف چلا جاتا ہے۔ میرے خیال میں چندر بھان خیال واقعی منیر نیازی سے متاثر ہے۔ منیر کی کلیات میں ایسی کئی نظمیں ہیں جنہیں پڑھ کر ایک عجب سے خوف اور دہشت کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ اس طرح کی کیفیت کا احساس خیال کی بعض نظمیں پڑھ کر بھی ہوتا ہے۔ ثبوت کے طور پر دونوں کی شاعری سے بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن میں صرف ایک پر اکتفا کروں گا۔ منیر نیازی کے پہلے مجموعے "تیز ہوا اور تنہا پھول" میں "صدا بصحرا" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے' ملاحظہ فرمائیے :-

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھنا گھنگور
وہ کہتی ہے ___ "کون ___"
میں کہتا ہوں ___ "میں"۔
کھولو یہ بھاری دروازہ
مجھ کو اندر آنے دو"۔
اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔

چندر بھان خیال کی نظم "دھماکہ" کے دو بند ملاحظہ ہوں :-

رفتہ رفتہ ابھرے گا عہد رفتگاں پھر سے
لوگ چیخ اٹھیں گے ہو کے بے اماں پھر سے
پھر سکوت کی سل پر بیٹھ کر بجائے گی
بین خوب رو ڈائن اور سانپ ڈولے گا
تلخ رات کا منظر جسم جب ٹٹولے گا
اپنے اپنے خیمے میں کوئی کچھ نہ بولے گا
پھڑپھڑائے گی ہر سو خواہشوں کی چمگادڑ
برچھیاں چبھی ہوں گی پنکھ پنکھ پر جس کے

میں نے جس خوف اور دہشت کی فضا کا ذکر اوپر کیا ہے اس کی تعمیر منیر کے یہاں تو اس کی نظموں کے متن سے ہوتی ہے جبکہ چندر بھان خیال کو لفظوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔

ان دونوں کے یہاں ایک اور مشترکہ شے وہ استعارے ہیں جو جنس یا اس کے تقاضوں کے اظہار کے لئے استعمال کئے گئے ہیں مثلاً شعلہ' زہریلا جادو' پھن' ناگ' وش' سانپ' اجگر' چیتا' گدھ' سادھو' چمگادڑیں وغیرہ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں اگر کسی Crude جنسی تجربے سے گزرتے ہیں تو اس کے اظہار کے لئے نرم' کومل لفظوں کو برتنے کی بجائے وہ تجربے جیسے ہی Crude الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ ان کے محسوسات اپنی تمام تر شدت کے ساتھ نمایاں ہو سکیں۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ "منفرد" انفرادیت کا حامل' یا فلاں چیز کی شناخت' وغیرہ ایسے لیبل ہیں جو اردو تنقید میں بلا جھجک چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یہ آسان ڈگر نہیں اپنائی۔ اردو تنقید کی اس معتبر شخصیت نے افسانہ طرازی کی بجائے صرف وہی کیا ہے جو ان کے ترازو پر پورا اترا ہے۔ ان کے ان تاثرات کے اقتباس کے ساتھ جو "گمشدہ آدمی کا انتظار" کے بیک کور پر شائع ہوئے ہیں' میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:-

"_____ ہم میں سے ہر شخص میں دراصل کئی شخص آلن لگے ہیں۔ پورے ہم پھر بھی نہیں۔ لیکن آوازوں سے آوازیں اور چراغوں سے چراغ کی لوئیں جلتی ہیں---- اردو پر نئی زمانہ جو پیغمبری وقت پڑا ہے اور اقدار شکنی اور نفسانفسی کا جو دور دورہ ہے' ایسے میں اگر کچھ دیئے ایسے بھی جلتے رہیں تو راہ کا اندھیرا اگر کم نہ ہوگا تو کم از کم بڑھے گا تو نہیں"۔

پنجابی زبان دا سبھ توں معیاری تے دلچسپ رسالا

سویر انٹرنیشنل

○ من سیکویاں پنجابی کہانیاں ○ دُوجیاں زباناں دِیاں بہترین کہانیاں دے ترجمے ○ سوچ اُسارن والے مضمون ○ کلچر تے ثقافت بارے فیچر ○ پنجابی تحریک بارے لکھتاں ○ ودھیا پنجابی شاعری تے ہور اوہ سبھ کُجھ جو کسے معیاری رسالے وِچ ہو سکدا اے (سال وِچ چار خاص شمارے)

نامور پنجابی لکھاریاں دیاں لکھتاں لے کے باقاعدگی نال ہر مہینے چھپ رہیا اے

□ اِک کاپی: 15 رپئے □ سالانا چندا: 150 رپئے' بھارت: 350 رپئے' باقی دیس: 50= امریکی ڈالر

پتا: 17اے' سٹریٹ 6' کوچا محمدی' سلطانپورا' لاہور 54900 (فون: 6821247)

اُداسی اور ویرانی کے لمحوں کو شاداب اور کامیاب

بنانے والی دیپک چوپڑا کی کتاب

کامیابی کے سات روحانی اصول

جسے معروف دانشور اور مترجم ظفر عظیم نے سلیس، رواں اور

جواں اُردو زباں کا ملبوس دیا ہے

پاکستان کے ہر اچھے
بُک سٹال پر دستیاب ہے

سلیم کاشر

گیت

سُن دا نئیں ونگاں دی چھن چھن
وے بے خبرا وے بے دردا
اینی وی نئیں ساڈی اَن بن
وے بے خبرا وے بے دردا

چھن چھن وچ مِنتاں لُکیاں نیں
ونگاں دیاں تہوناں جھکیاں نیں
ہن غصّہ اے بیکار سجن !
وے بے خبرا وے بے دردا

سبھ پِشلیاں گلاں بھُل وی جا
توُں نال مرے ہُن کھُل وی جا
میری نئیں اکھیاں دی تے مَن
وے بے خبرا وے بے دردا

کر تھوڑی جھئی تے دل جوئی
پھُل جوڑے دے وچ لا کوئی
پیاراں دا کھڑیا دیکھ چمن
وے بے خبرا وے بے دردا

افتخار نسیم
(شکاگو)

میری کوئی زبان نئیں

کسے نوں غلام بنانا ہووئے
تے اوہدی ماں بولی کھولوؤ
آپس وچ کوئی رابطہ نئیں رئے گا
زبان نوں رزق دا مسئلہ بنا دوؤ
تے ساری اَنخ مر جائے گی
اَن پڑھاں نوں شمس العلما بنا دوؤ
تے علم دا چانن مُک جاوے گا

انگریزاں نے دی ایہو کیتا
تے امریکناں نے دی
جدوں اوہ افریقی کالیاں نوں
غلام بنا کے لے گئے تے اوہناں نوں
اپنی ماں بولی بولن دی اجازت نہ دتی
آزادی دے بعد دی ساڈھے مُنڈے تے کُڑیاں
اِک "مضمون" وچوں فیل ہوندے رہے

ساڈے لہجے دے مذاق اُڈدے رہے
صحت الفظی ساڈی زبان وِنگی کر گئی
اسی اندروں کُجھ تے باہروں کُجھ ہو گئے
گورا صاحب گیا تے کالا صاحب آ گیا
اَسی پڑھے لکھے اَن پڑھ ہو گئے
میں بارہ ہزار میل تے جاہی ورھے
دُور آکے ویکھیا اے
کہ میں سارا دن انگریزی بولدا ہاں
اُردو وچ خط لکھدا ہاں
پنجابی وچ سوچدا ہاں
میری کوئی زبان نئیں

اعزاز احمد آذر

گیت

نازک نازک جیئے شاہلہ حُسن ترے دی خیر
پُھل وی جیکر سر تے رکھئے ڈولن تیرے پیر

توں ایں کوئی توت دی ٹہنی
یاں کوئی سرہوں دی گندل
تیرے ساہواں دی خشبو توں
اکھ چرا لے صندل
نظراں دے وچ گھلدا جاوے
روپ دا مٹھا زہر۔۔۔

چن دی ٹٹ کے کھِلر جاوے
جے توں چکیں پلکاں
چڑھدے ہوئے طوفاں وانگوں
جوبن مارے ڈھلکاں
نال قیامت لے کے آیا
حُسن دا پہلا پہر۔۔۔۔

ٹور تری نوں ویکھ کے سکھیا
ٹرنا آپ ہواواں
جہڑے پاسے پیر توں رکھدی
وچھدیا جاون راہواں
ٹُردی ٹردی جے رُک جاویں
ویلا جاوے ٹھہر۔۔۔۔

ایمن خیال

غزل

اوہدا جھُگا چوراں لٹیا !

جنھے حق کسے دا گھٹیا !

ہڑ درداں دے اپنے آئے

اکھاں وچوں نیر نکھٹیا

اکھ شکنجے جنھوں کڑیا !

اوہ نہ ایس کڑکیوں چھُٹیا

میرا وی کوئی لاہے تھکیواں

جد گھر آواں تھکیا ہٹیا

ہنجواں والا اک اک سوما

پلک پلک دی ٹیسوں پھُٹیا

اوہدیاں سوہیاں بلھیاں اگے

تیری کیہ اوقات اے گُٹیا

چاواں نال خریدیا سجنا

ساتھوں چنگا ایں توں بھڑیا

سن کے اوہدی گل پتھریلی

دل نازک دا شیشہ ٹٹیا

ریجھاں نال خیال سی لایا

دیلے بوٹا آس دا پُٹیا

محمود رحیم

غزل

عشق نیں چوڑ چپٹ جندڑی الہڑی جئی

یاد نیں کیتی ساڈے نال کو لڑی جئی

لوکی کہن حیاتی بوہت سیانی اے

ساڈے نال تے او دی جھلی وللڑی جئی

کل تک جتھے بُلبل چہکدی کوکدی سی

اَج اوتھے دو اکھاں تے کجھ کھلڑی جئی

ہور تے ناں سئی سچے کھوٹے نکھڑے لوک

پھردے رہے بنا کے صورت جھلڑی جئی

تشبیہاں تے مثالاں سب اولڑیاں سن

شکل سی میرے یار دی کجھ اولڑی جئی

شہر دے لوک نیں ظالم، لوبھی، نکری جئے

جان رحیم دی نازک اتے سکھلڑی جئی !

نظر ملک

غزل

اوہ ضدل اُنْ من جے کسے دی من جاوے
نئیں اِتبار اُس جے کسے دی من جاوے

اُس جیڈا کوئی گھیتڑ پاچڑ تکیں نئیں
وڈھ بوڑے داکن جے کسے دی من جاوے

منتاں ترلے، جیجڑیاں بھوں کیتیاں ہن
چھوڑکے پاگل پن جے کسے دی من جاوے

سنگی بیلی نچنْ گاونْ گلیاں وچ!
چڑھے خوشی دا چن جے کسے دی من جاوے

دشمنیاں دے بھانبھڑ ٹھڈے پے ویس
ہک ادھلو کرڑن جے کسے دی من جاوے

سکھوِندر امرت
(بھارت)

غزل

سورج دی دہلیز سلابی ہوئی ہے
کوئی برہن تڑکے تڑکے روئی ہے

دس دلا ہن کس کونے دفنائیں گا:
پھر اِک حسرت تڑپ تڑپ کے موئی ہے

کنج لُکوواں، میں برہوں دے زخماں نوں
تن اُتے یاداں دی پاٹی لوئی ہے

رویاں اگ نہ بجھدی لوکو برہے دی
جد وی روئے دُون سوائی ہوئی ہے

اُگے گی ایہہ بن کے بوٹا پیڑاں دا
حسرت جیہڑی سینے وچ لکوئی ہے

ماں دے پیار تے سکھیا دے پھل مہکے نیں
میرے ساہاں اندر جو خشبوئی ہے

ادب کے ذوقِ نفاست ـــــ اور
عذرا اصغر کے حُسنِ ادارت کا مرقّع

ماہنامہ **تجدیدِ نو**

معاون : شبہ طراز

پوسٹ بکس ۲۹۸۶ جی پی او . اسلام آباد

نوجوان شاعر زمان کنجاہی اب نئے انداز میں سامنے آتے ہیں

ماہنامہ **غنیمت**

دل نشین تحریروں کا حسین مجموعہ

سعادت بلڈنگ، ایبٹ روڈ۔ لاہور

علم و ادب اور حکمت و دانش
کی دُنیا میں ایک اور اہم نام

ماہنامہ **جمالستان** لاہور

مدیرِ اعلیٰ
حکیم ولی الرحمٰن ناصر

۳ سی - عوامی فلیٹس - ریواز گارڈن - لاہور

نئی آواز ـــــ نیا انداز
ادب پرور ـــــ دوست نواز

ادب دوست

اے جی جوش کی ادارت میں
شائع ہونے والا ماہنامہ

۳۳۔ طارق بلاک۔ نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۵۴۶۰۰

تبصرے

جوش شخص اور شاعر

مصنف : اکرام بریلوی

صفحات : 120 قیمت : 120 روپے، / 10 ڈالر

ناشر : بزم جوش، کینیڈا

تبصرہ : جمال نقوی علیگ

"جوش شخص اور شاعر" جوش صدی کے سلسلے میں بزم جوش کینیڈا کی خواہش پر معروف ادیب و ناول نگار اکرام بریلوی صاحب کا تحریر کردہ ایک طویل مقالہ ہے جس میں انہوں نے اردو کے عہد آفریں شاعر اور دور جدید کے نقیب حضرت جوش ملیح آبادی کی شخصیت اور شاعری پر عالمانہ انداز سے گفتگو کی ہے اور بقول ان کے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے جو بربنائے مصلحت اس عظیم شاعر کے سلسلے میں برتا جا رہا ہے ورنہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی اس بات پر فخر کرنا چاہئے کہ آج اردو ادب کا وہ نامور شاعر اسی سرزمین میں آسودہ خاک ہے۔

صدر جوش لٹریری سوسائٹی، کینیڈا جناب اقبال حیدر کی یہ بات قابل غور ہے کہ اس عظیم مفکر شاعر جس کے ہم سب یکساں طور پر مقروض ہیں، اس کی صدی اور یاد منانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ہر اہل قلم اپنے طور پر کچھ نہ کچھ لکھے۔

شاعر انقلاب، مصور شباب اور حکومت ہند کا سب سے بڑا ادبی اعزاز پدم بھوشن، کے حامل شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی گوناگوں شخصیت اور وسیع کلام کو جناب اکرام بریلوی نے اپنی ماہرانہ چابکدستی سے ایک مختصر کتاب کی صورت دی یعنی سمندر کو کوزے میں بند کر دیا، اور اس کتاب کو سجانے اور سنوارنے کے بعد طباعت کی منزلوں تک پہنچانے کا کام نکہت بریلوی نے انجام دیا۔ اس طرح ان تمام لوگوں نے حضرت جوش کے اس شعر کی صداقت کا ثبوت دیا۔

سو سال بعد آئے گی جس کی زمیں پہ فصل
میں بدنصیب وہ ثمر نو رسیدہ ہوں

امید ہے بزم جوش، کی یہ پیش کش ادبی حلقوں میں پسندید کی جائے گی۔

ماہ مایا

مصنف : سلمان صدیق

تبصرہ : اسرار زیدی

"ماہ مایا" جواں سال شاعر اور تخلیق کار "سلمان صدیق" کا اولین ناول ہے۔ سلمان بذات خود ایک باصلاحیت اور ذہین نوجوان ہے چنانچہ اس کے ناول "ماہ مایا" کی نفسیات اور پس منظر کو جاننے کے لئے خود مصنف کی اپنی سائیکی کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز شاعری سے کیا۔ ایک شعری مجموعہ چند سال قبل شائع ہو چکا ہے اور دوسرا زیر طبع ہے۔

ان سطور میں سلمان صدیق کی شاعری کا جائزہ لینا مقصود نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ بنیادی طور پر شاعر ہوتے ہوئے اس سے ناول نگاری کی طرف کیوں توجہ دی جبکہ شاعری اور ناول نگاری قطعاً" مختلف اصناف ہیں ان کے لوازمات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اس ضمن میں سیدھی سادی سی بات تو یہی ہے کہ اس نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار میں شاعری کو ناکافی سمجھتے ہوئے ناول کو ترجیح دی۔ البتہ اس امر کا تجزیہ ناگزیر ہے کہ "ماہ مایا" ناول نگاری کی مبادیات پر تکنیکی حوالے سے پورا اترتا ہے یا نہیں؟

بظاہر اس ناول میں کوئی نیا اور چونکا دینے والا تجربہ موجود نہیں ویسے بھی "ماہ مایا" کے مطالعے کے بعد اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے مصنف نے بذات خود شعوری یا لاشعوری سطح پر کسی نئے تجربے کو شامل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بیانیہ انداز کے اس ناول کا مرکزی کردار خود سلمان صدیق ہی نظر آتا ہے۔ اس کی سائیکی اس امر کی آئینہ دار ہے۔ وہ بجا طور پر ایک باصلاحیت اور اپنی ذات میں الگ رہنے والا تخلیق کار ہے۔ ذاتی پروجیکشن اور شہرت بے شک ایک فطری امر ہے تاہم یہ اس کا مسئلہ نہیں ہے۔

"ماہ مایا" کا مرکزی کردار ایک طرح اول و آخر عدم اطمینان کا شکار نظر آتا ہے۔ اس کی زندگی میں جو بھی رشتے موجود ہیں وہ رشتے ہر چند اسے بے حد عزیز ہیں اس کے باوجود ان رشتوں سے زیادہ مطمئن نہیں۔ اس کا اظہار اس کے شعری مجموعے میں موجود انتساب سے بھی ہوتا ہے۔

ایک حساس اور جذباتی نوجوان لکھاری اپنی تحریر میں ان تجربوں کو تو شامل کرتا چلا جاتا ہے جن سے وہ وقتاً" فوقتاً" گزرتا رہا ہے اس نوع کی تحریر بالعموم ان تقاضوں کو زیادہ کامیابی کے ساتھ پورا نہیں کرتی جو تکنیکی سطح پر توازن اور ٹھہراؤ سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود سلمان صدیق نے شعوری سطح پر ان تقاضوں کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسے بخوبی اس امر کا احساس ہے کہ آج کے تجربے مستقبل میں کوئی نیا رخ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

جذبے کا اظہار سچائی کا مظہر ہوتا ہے البتہ یہ امر ناگزیر ہے کہ موضوع پر گرفت برقرار رکھنے کے لئے اس اظہار میں توازن موجود ہو۔ زیر بحث ناول میں موضوعی سطح پر دو رو ساتھ ساتھ چلتی ہیں ایک رو تو اس کے مرکزی کردار کی انا سے متعلق ہے اور دوسری رو وہ عدم اطمینان ہے جو اس کردار کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اسے آپ احساس محرومی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں انا اور احساس محرومی جس نفسیاتی پیچیدگی کو جنم دیتے ہیں دیکھا جائے

تو "ماہ مایا" کا مرکزی خیال یہی نفسیاتی پیچیدگی ہے۔

میرے نزدیک انا اور احساس محرومی سلمان صدیق کی کمزوری کے باوجود خوبی بھی ہے کہ اس نے اپنے ان رویوں کو ظاہری عوامل سے کیموفلاج نہیں کیا نا ہی انہیں مسئلہ بنایا ہے اس کے برعکس اپنے جذبات و احساسات کو اپنے تخلیقی رویوں میں منتقل کیا ہے۔

اس مرحلے پر یہ کہنا بھی غیر ضروری نہ ہو گا کہ کسی تخلیق کے حوالے سے اختلاف رائے ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ اسے نیک فال سمجھا جانا چاہئے کہ کسی تصنیف کو مختلف زاویوں سے جانچا اور پرکھا جائے۔ ابتدائی سطح پر سلمان صدیق کے اس ناول پر کئی اطراف سے جو لے دے ہوئی وہ اس کے نام "ماہ مایا" پر ہوئی۔ معترضین کا خیال تھا کہ مختلف زبانوں کے الفاظ سے ایک مرکب کی تشکیل ناتو درست ہے نا ہی مستحسن! میرے نزدیک یہ اعتراض یوں بے جا ہے کہ اردو زبان بذات خود مختلف زبانوں کے ارتباط سے متشکل ہوئی ہے۔ اب یہ بات بھی کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ آج کے عہد میں وہی زبان ارتقاء کے عمل سے گزرتی ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ ضم کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس صورت میں "ماہ مایا" اگر دو زبانوں کا مرکب ہے تو اس میں قباحت کونسی ہے۔ یوں بھی ایک تصنیف کا نام کسی بنیادی حیثیت کا حامل نہیں ہوتا اس کے برعکس اسے موضوع اور مواد کی روشنی میں دیکھا جانا چاہئے۔

اس حوالے سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ نارسائی کا دکھ ایک سے زیادہ المیوں کو جنم دیتا ہے داخلی اور ذہنی انتشار' احساس محرومی حتیٰ کہ انا کی شکست اور اس کے علاوہ بہت کچھ۔ اوائل عمری میں شعور کی سطح وہ نہیں ہوتی جو آئندہ کے تجربوں سے تشکیل پاتی ہے۔ سلمان صدیق کے ناول "ماہ مایا" کو میں نے انہی حوالوں سے دیکھا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے ضروری نہیں کہ اس ناول کے دوسرے قارئین پر یہ رائے مسلط کروں۔

کاندھے پہ دھرے ساز

مصنف : زاہد حسین بھٹی

ضخامت : 240 صفحات' قیمت : 150 روپے

ناشر : غالب نما' ایف اے /10 وحدت کالونی' لاہور

تبصرہ : سید نواز حسن زیدی

زاہد حسین بھٹی کا شمار ہمارے ان نئے نوجوان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت کم عرصے میں اپنے منفرد نثری اسلوب کے ذریعے اپنے قلم کی پہچان کرائی ہے۔ زیر نظر کتاب ستر کی دہائی کے نامور شاعر ثروت حسین کی شخصیت' حالات زندگی اور شاعری کے محاکے پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مطالعے سے جہاں ایک اہم شاعر کی زندگی کے نمایاں رخ ابھر کر سامنے آئے ہیں وہاں ان اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہیں جو ثروت حسین کی خودکشی کا باعث بنے۔ کتاب مین نہایت تفصیل سے ثروت حسین کی ذات میں پلنے والی ان نفسانی پیچیدگیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک اعلیٰ

شاعر کی شکست ذات اور شخصیت کے عدم توازن کو راہ دکھاتی ہیں اور بالاخر اس نے ٹرین تلے سر رکھ کر خود کو دنیا کے جھمیلوں سے آزاد کر لیا۔ کتاب میں ثروت حسین اور پروین شاکر کے عشق کے حوالے سے بعض ایسے حقائق بھی بیان کئے گئے ہیں جو اس سے پہلے منظرعام پر نہیں آئے۔ ثروت حسین کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے زاہد حسین بھٹی نے انہیں اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد اور نئے لہجے والا شاعر قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں ثروت حسین مکاشفہ اور رویا کی طاقت لے کر شاعری کی بساط پر اترے جن کی ایک آنکھ ہزاروں سال پرانی تہذیب کے کھنڈروں پر کھلی اور دوسری آنکھ مستقبل کے ان احکامات پر تھی جسے وہ ماضی کی تہذیب سے روشنی حاصل کر کے منور کرنا چاہتے تھے۔

کتاب کے آغاز میں عبدالکریم خالد کا لکھا ہوا ایک مبسوط دیباچہ شامل ہے جس میں انہوں نے زاہد حسین بھٹی کی اس کاوش کو نہایت عمدہ الفاظ میں سراہا ہے۔ عبدالکریم خالد کے الفاظ میں "زاہد حسین بھٹی نے تحقیق' تنقید اور تخلیق کو باہم یوں ملا دیا ہے کہ ان کی نثر ایک منفرد ذائقے کی حامل ہو گئی ہے" کتاب میں ثروت حسین کی بعض خطی تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ جنہوں نے اس کتاب کی اہمیت دو چند کر دی ہے۔ زاہد حسین بھٹی کی اس کتاب کو 1998ء میں شائع ہونے والی اہم کتابوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

سلام مچھلی شہری ـــــ شخصیت اور فن

مصنف : ڈاکٹر عزیز اندوری

قیمت : 200 روپے

ناشر : ساقی بک ڈپو' اردو بازار دہلی' 110002

تبصرہ : ادارہ

یہ تجزیے اور نظارے ہوتے ہی رہتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے برصغیر کے ادب کو کیا کیا فائدے پہنچائے اور اس سے کیسا کیسا نقصان ہوا ـــــ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ یہ تحریک عرصہ ہوا' اصلاً" مر چکی ہے مگر اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں ایک یہ الزام یا بیان بھی اکثر دہرایا جاتا ہے کہ اس تحریک سے ناوابستہ مصنفین کو نہ صرف جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا بلکہ تحریک سے وابستہ ان سے کم تر لوگوں کو نمایاں کیا گیا۔

سلام مچھلی شہری کے بارے میں بھی عزیز اندوری نے اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ قوم پرست شاعر تھے جن کے دل میں وطن اور انسان سے پیار بہرانداز تھا۔ عزیز اندوری کی اپنی ادبی حیثیت بھی مسلمہ ہے ان کی زیر تبصرہ کتاب' ان کے ڈاکٹریٹ کا تھیس ہے' جس میں انہوں نے سلام کی ادبی ہمہ صفتی کو بہت خوبی اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اپنے تھیسس یا سلام کی شخصیت و فن کے بارے میں نظریے کو عزیز اندوری نے کتاب کے شروع میں سلام مچھلی شہری کی تصویر کے اوپر سلام ہی کے اس شعر کو درج کر کے سلام کے مزاج اور اپنے موقف کو واضح کر دیا ہے۔

مجھے یقین ہے مرے مصلحت شناس ناقدو

ابھی نہیں تو جلد ہی ضرور یاد آؤں گا

کتاب خوبصورت چھپی ہے مگر کتابوں کی ہر شربا قیمتوں کا ادبی المیہ اب بھارت میں بھی جنم لے رہا ہے پاکستانی ناشروں کی خود غرضی کے ساتھ ساتھ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کاغذ' طباعت اور متعلقہ لیبر بہت مہنگی ہے۔ بھارت میں یہ سب نہیں ہے اور پھر وہاں پر تمام سرکاری اکادمیاں بھی ایسی ادبی کتابوں کی مالی معاونت کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں اس کتاب کی قیمت دو سو روپے بہت زیادہ ہے۔

The Agrarian History of Pakistan

مصنف : اے _ کے _ خالد

ضخامت : بڑے سائز کے 357 صفحات' قیمت : 475 روپے

ناشر : الائیڈ پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تبصرہ : پیروز بخت قاضی

عبدالکریم خالد ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ زمیندارہ کالج گجرات اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ 1946ء میں گریجویشن کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ قبل ازاں سکول کے زمانے میں ہی عربی فاضل' فارسی فاضل اور اردو فاضل کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے۔ تاریخ اور فارسی میں ڈبل ایم اے اور پھر ایل ایل بی کے امتحانات میں نمایاں طور پر کامیابی حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں زمیندارہ کالج گجرات کے ادبی جریدے "شاہین" اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی جریدے "راوی" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

صوبائی سول سروس کے مقابلے کا امتحان پاس کر کے 1949ء میں ملازمت شروع کی۔ مختلف اضلاع میں اہم انتظامی عہدوں پر کام کیا۔ ڈپٹی کمشنر' کمشنر' صوبائی حکومت کے سیکرٹری اور ممبر بورڈ آف ریونیو کے اہم عہدوں پر فائز رہے اور موخرالذکر عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ عبدالکریم خالد انتظامی' عدالتی' فوجداری اور محکمہ مال کے امور کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں اور ان کے فیصلے قانونی جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد عبدالکریم خالد نے محنت شاقہ سے زیر نظر کتاب تصنیف کی ہے۔ کتاب تین حصوں اور تئیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کے آخر میں حوالہ جات کے لئے کتب کی فہرست اور کتاب کے آخر میں تین ضمیمے شامل کئے گئے ہیں۔ کتاب نہایت عمدہ انگریزی میں تحریر کی گئی ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ میں برصغیر پر مسلمان حکمرانوں کے دور میں رائج زرعی نظام کی تاریخ درج ہے۔ ظاہر ہے ابتدائیہ کے طور پر مسلمانوں کی آمد سے قبل قدیم ہندو دور حکومت کے زرعی نظام کا بیان بھی لازمی طور پر شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں برطانوی دور کے زراعتی نظام کی تشکیل اور ارتقا کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ قیام پاکستان کے بعد کی تبدیلیوں کے نفاذ اور مستقبل کے لئے مفید تجاویز بیان کی گئی ہیں۔

زمین کی ملکیت' کاشتکار کے حقوق' بٹائی کے قوانین' بندوبست اراضی' اشتمال اراضی' زرعی مالگزاری کے

اصول و قوانین' زرعی جاگیریں' زرعی آباد کاری' زرعی اصلاحات' مالیہ' آبیانہ اور اسی قسم کے دیگر کئی مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب افسران مال' وکلاء' عدالتوں' قانون اور تاریخ کے طالب علموں کے لئے وسیع ذخیرہ علم رکھنے کی وجہ سے بے حد مفید ہے اور ریسرچ سکالروں کے لئے اہم حوالے Reference Book کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنف کے 36 سالہ عملی تجربہ کا نچوڑ اس کتاب میں شامل ہے جو انگریزی زبان کے قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ثابت ہو گا حکمرانوں اور قانون سازوں کے لئے یہ کتاب پاکستان کی زرعی معیشت اور قوانین مالگزاری جیسے امور میں راہنمائی کے لئے بے حد مدد گار ثابت ہو گی۔

''لہراں'' پیر فضل نمبر

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید اختر حسین اختر

مل خاص نمبر : 100 روپیا

پتا : سوڈیوال کالونی ملتان روڈ' لاہور

تبصرہ : ادارہ

جنہاں لوکاں پنجابی زبان نوں مان تران دتائے جنہاں دے دم نال اج پنجابی لکھن وایساں دا سر اچا اے' اوہناں وچ پیر فضل گجراتی دا ناں بڑا نمایاں اے ___ پیر فضل نے پنجابی شاعری تے خاص کر کے پنجابی غزل نوں نواں رنگ' ڈھنگ تے پکی پیڈی بنیاد دتی۔ پنجابی غزل سبھ توں پہلوں کنھے لکھی' ایہہ کھوج تے نکھیڑا کرنا نقاداں دا کم اے' پر ایہہ گل حقی اے' پیر فضل نے غزل نوں جنھی سوھج دتی اوہ اوہناں توں پہلوں گھٹ گھٹ مل دی سی۔ سدھا پدھرا دل کھچواں انداز تے بولدیاں تے گاندیاں بحراں ___ نظماں وچ وی اوہناں نیں ایہو اسلوب اپنایا اے ___ کجھ غزل دے شعر ویکھو ___

رنگ کھلا میری وحشت دا ہو کٹھے کجھ ہمدرد گئے
اوہ رورو پچھن حال مرا' میں کھڑ کھڑ ہساں کیہ دساں
کیوں فضل سودائی ہویائیں پلے دیاں لیراں لاہیاں نی
پھڑ لوکی پلہ پچھدے نیں میں پلہ کھساں کیہ دساں

بیٹھا روز حسیناں دے کول رہناں وہندا روز خدا دا نور رہناں
اک وار رہ گیا سی طور جل کے میں ہر روز جلدا مثل طور رہناں
دل وچ آکھدا رہناں واں' ایس واری رکھدیاں گا کھول کے حال دل دا
آ سامنے جان اوہ جدوں میرے' کردا صرف حضور حضور رہناں

پیر فضل نمبر وچ اوہناں دی شاعری دا انتخاب شریف کنجاہی ہوراں کیتا اے تے سوا دو سو صفحے دے ایس نمبر وچہ نامور لوکاں دے نال نال نویں لکھن والیاں وی نڑ اتے نظم راہیں پیر فضل نوں یاد کیتا اے ___ سرورق تے آرٹسٹ رومی نے اوہناں دا بڑا سوہنا سکیچ بنایا اے۔

تمہارے لئے

شاعرہ : روشن آراء نزہت

ضخامت : 128 صفحات' قیمت : 120 روپے

ناشر : انکشاف پبلی کیشنز' لاہور

تبصرہ : ادارہ

روشن آرا نزہت ناول نگار اور افسانہ نویس کے طور پر زیادہ مقبول ہیں' مگر اب وہ نثری نظموں کی شاعرہ کے طور پر بھی سامنے آئی ہیں اور اس طرح سے بھی اپنی حیثیت تسلیم کروانے کی کوشش کی ہے۔ یہ عجیب بات ہے' اور ریکارڈ پر آنے کے قابل ہے کہ روشن آراء نزہت کا پہلا ادبی تعارف نظم ہی سے ہوا تھا اور وہ "تخلیق" میں شائع ہوئی تھی ___ تب وہ جرنلزم کی طالبہ تھیں۔

نزہت نے نثری نظم کا آسان راستہ کیوں اپنایا ہے یہ بات نہ انہوں نے واضح کی ہے نہ غزل گو عبدالعلی شوکت (جو ان کے جیٹھ بھی ہیں) نے اپنے اظہاریئے میں کھولی ہے ___ یہاں تک کہ ممتاز ادیب یونس جاوید نثری نظم کا منکر ہونے کے باوجود روشن آراء نزہت پر ایمان لے آیا ہے۔ نثری نظم سے اختلاف یا اتفاق دوسری بات ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ روشن آراء نزہت جیسے لکھنے والے وزن میں شعر کہہ لکھتے ہیں اور نظم بھی تخلیق کر سکتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہیں' ان احساسات کو کہانیوں کا روپ بھی دے سکتی تھیں۔

یونس جاوید اور عبدالعلی شوکت نے چونکہ ان نظموں کی تعریف کی ہے' اس لئے ہم بھی آمنا و صدقنا کہہ دیتے ہیں ___ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ایک سو اٹھائیس صفحے کی سادہ سی کتاب کی قیمت ایک سو بیس روپے ہے۔ پتا نہیں کیوں عام قاری اور کتاب کے درمیان فاصلہ بڑھایا جا رہا ہے۔

نہیں

شاعرہ : نزہت انیس

قیمت : 100 روپے

ملنے کا پتا : فرید پبلشرز' نوشین سنٹر' اردو بازار' کراچی

تبصرہ : ادارہ

شاعرہ کا غزلوں' نظموں اور نثری نظموں کا اگرچہ یہ پہلا مجموعہ ہے مگر ان کے لہجے میں جو طنطنہ ہے' وہ کچھ مناسب نہیں لگا۔ انہوں نے کتاب کے آخری صفحوں میں اظہار تشکر کے عنوان سے لکھتے ہوئے جو انداز اپنایا ہے' اس میں انکسار نہیں ___ ان کے استاد محترم محسن بھوپالی مرنجان مرنج اور وضع دار ہیں' شاید انہوں نے بھی ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شعر میں انا کی سربلندی کا مرحلہ آجائے تو غرور برا نہیں لگتا۔ اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے یہ اظہار نخوت کی طرح لگا ہے۔ سینئر شاعرہ شاہدہ حسن نے اگرچہ چند سطریں لکھیں ہیں مگر ان کی تحریر کا دھیما پن مثالی ہے۔ نزہت انیس کو اسی سے سیکھ لینا چاہئے تھا۔

نزہت انیس اچھی شاعرہ ہیں' اس سے انکار نہیں اور پھر انہیں سند بھی حاصل ہو گئی ہے مگر شاعرہ نے' ان کے استاد محترم نے اور دوسروں نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ انہوں نے اپنی ایک نظم پر جو عنوان جمایا ہے اس کے ہجے غلط چھپ گئے ہیں۔ فہرست میں بھی ایسے ہی ہیں اور دیباچہ لکھتے وقت محسن بھوپالی نے بھی وہی لکھ دیئے ہیں۔ اس سے ہم جیسے ادب اور علم کے طالب علم کو بڑا مغالطہ ہوتا ہے۔ کوئی دس پڑھے لکھے لوگوں سے پوچھا' ڈکشنریاں دیکھیں تو کھلا اصل لفظ ___ "SENTIENT" ہے "SANTIENT" نہیں۔ اسی طرح قوس و قزح لکھا گیا ہے ___ پتا نہیں' لوگوں کو اتنی عجلت کیوں ہوتی ہے' ___ ایک غزل میں وفاؤں ہواؤں کا قافیہ راہوں باندھا ہے۔ دوسری میں نیلے' گیلے اور پیلے کے قافیے پھیلے اور پہلے آگئے ہیں۔ ایک مصرعے میں پیمانی کرنا استعمال ہوا ہے:

وہ بھی شدت سے کرتا پیمانی ہے

پتا نہیں' یہ لفظ کہاں سے آیا ہے---؟ اسی غزل کے مطلع کا پہلا مصرع ہے:

پت جھڑ کا موسم بھی کوئی خزانی ہے

زبان میں نئے لفظ تخلیق کرنا اچھا عمل ہے مگر معانی کی خوبصورتی کے ساتھ ___ اور پھر یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے' ایسا کرنے والے کا ادبی مقام و مرتبہ کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہ جس کا جی چاہا' زبان و ادب سے کھیل لیا۔ محسن بھوپالی جیسے معتبر اور باوقار لوگوں کو اپنے شاگردوں کی بھی اپنے جیسی تربیت کرنی چاہئے۔

اداس لمحے

شاعر : بابر بخاری

ضخامت : 100 صفحات قیمت : 80 روپے

ناشر : الحمد پبلی کیشنز' رانا چیمبرز' چوک پرانی انارکلی' لاہور

تبصرہ : سید عباس رضا

بابر بخاری ایک نوجوان ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ جنہوں نے وطن سے دور برطانیہ میں رہ کر اپنے شعری ذوق کو پروان چڑھایا ہے۔ "اداس لمحے" ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس میں انہوں نے غزلوں' نظموں' گیتوں' قومی نظموں اور ماہیوں کی صورت میں اپنے احساسات اور جذبات کو شعری زبان میں پیش کیا ہے۔ بابر بخاری چونکہ شعری میدان

میں ابھی نووارد ہیں لہٰذا ان کی شاعری کو تنقید کے سخت اصولوں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ تاہم انہوں نے بساط بھر یہ کوشش کی ہے کہ وہ اپنے نرم و نازک احساسات کو من و عن شاعری میں پیش کر سکیں۔ شاعری کے فنی مباحث میں الجھے بغیر ہم اسے ان کے سچے اور کھرے جذبات کا آئینہ قرار دے سکتے ہیں جس میں ہر صاحب دل اپنے جذبات اور کیفیتوں کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ "اداس لمحے" بابر بخاری کے اندر کی آواز ہے اور اس کی روح سے نکلی ہوئی صدا ہے۔ اس میں ان تمام موسموں کے رنگ ہیں جو شاعر کے اندر ہی اندر آنکھ کھولتے اور فضا کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ کتاب سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یا رب تو اس کے ہونٹ پہ نرمی اچھال دے
گل مانگنے لگا ہے دعا خار کے لئے
ساقی تری شراب اگلتی ہے نیکیاں
دو گھونٹ اور بھیج گنہ گار کے لئے

چپ چاپ سہ رہا تھا زمانے کا ہر ستم
دل میں اٹھائے شور بڑی خامشی کے بعد
کوشش کے باوجود بھی آنکھیں نہ کھل سکیں
دیکھی تھی میں نے روشنی جب تیرگی کے بعد

تجدید نو ___ نشاط فاطمہ نمبر

مدیران : عذرا اصغر' شبہ طراز
قیمت : 50 روپے
پتا : المہدی ___ پنڈوریاں روڈ' برما چوک' اسلام آباد - 44000
تبصرہ : ادارہ

برسوں سے یہی چلن چلا آ رہا ہے کہ کچھ دنیا دار ہوتے ہیں جو ہر حال میں ہر دور میں جھولیاں بھرتے رہتے ہیں کچھ وضع دار ہوتے ہیں جو محبت' مروت اور ایثار کی خاطر لٹتے رہتے ہیں' اپنا آپ لٹاتے رہتے ہیں۔

عذرا اصغر بھی اسی قبیلے کی فرد ہیں۔ ادب کی ریاضت کو عبادت سمجھتی ہیں اور اسی لگن میں "تجدید نو" نام کا رسالہ سفید ہاتھی کی طرح پال رکھا ہے۔ اپنے پیش رووں کی حالت سے عبرت نہیں پکڑی۔ چند بہی خواہوں اور مداحوں کے اصرار پر ادب کی خدمت کا شوق چرایا اور اپنا اور اپنے گھر والوں کا سکھ چین گنوایا ___ ادب تخلیق کرنا اور بات ہے' پرورش لوح و قلم کرنا دوسری بات ہے سو اس میں کسی سے داد کیا پانا اور فریاد کیا کرنا ___

تجدید نو' ایک عرصے کے تعطل کے بعد "نشاط فاطمہ نمبر" کی صورت میں سامنے آیا ہے مگر اس حال میں کہ نہ

اشتہار نہ کوئی اور حاصل حصول ___ نشاط فاطمہ کے انتقال پر چونکہ اعلان کردیا گیا تھا لہٰذا وضع داری نبھانا ضروری تھی۔

نشاط فاطمہ کتنی بڑی ناول نگار تھیں اور ادب میں ان کا کیا مقام تھا' یہ کسی اہل نظر نے دیانت داری سے بیان نہیں کیا' اس لئے کہ نہ وہ کسی ادبی گروپ سے وابستہ تھیں نہ جھوٹی ادبی شہرتیں بٹورنے کے فن سے آگاہ ___ یوں وہ ہمیشہ پس پردہ رہیں۔

قریباً" سوا سو صفحے کا یہ نمبر بہت اہمیت کا حامل ہے اور لائق صد تحسین۔ الطاف فاطمہ' آغا سہیل اور محمد فضل قدیر کے مضامین بہت بھرپور ہیں جن سے مرحومہ کے فن و شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ادب کہانی 96ء

مصنف : ڈاکٹر انور سدید

تبصرہ : رفاقت علی شاہد

معاصر ادب کے جائزے کی قدیم صورت شعرا و ادبا کے تذکرے ہیں۔ تذکروں کی تخلیق کا مقصد بظاہر معاصر ادب کا جائزہ لینا نہ تھا لیکن ان کے ذریعے یہ مقصد جزوی طور پر پورا ہوتا رہا۔ تذکروں کی ترقی یافتہ شکل ادبی تاریخیں ہیں ___ تذکرے اور ادبی تاریخیں محدود تخلیقات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں صرف قابل ذکر تخلیقات کا ذکر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس باقاعدہ ادبی جائزے میں اس امر کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ بیش تر ادبی تخلیقات کا ذکر کیا جا سکے۔ میرا خیال ہے' نوعیت کے اس فرق کے باوصف ادبی تاریخوں اور ادبی جائزوں کا مطمح نظر ایک ہی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپ امر ہے کہ ادبی تاریخوں کی تخلیق سے بہت پہلے سالانہ ادبی جائزے کی روایت کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ یہ ڈیڑھ صدی قبل 1850ء کی بات ہے اور بڑی عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں یہ منفرد روایت ہندوستان سے بہت دور' پیرس میں شروع ہوئی۔ اس روایت کے بانی معروف مستشرق گارساں دتاسی تھے۔ انہوں نے 1850ء میں ہندوستانی ادبیات کے سالانہ جائزے کا سلسلہ شروع کیا جو 1877ء تک چلا۔ ان جائزوں پر مشتمل ان کے خطبات و مقالات کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو' کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

کارساں دتاسی سے ہوتی ہوئی ادبی جائزوں کی یہ روایت ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید تک پہنچی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نہ صرف اس روایت کے امین ہیں بلکہ جس دل جمعی' تفصیل اور تنقیدی نظر سے انہوں نے جائزے لکھے ہیں' ان کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس روایت کو ایک نیا موڑ دیا ہے' ایک نئی سمت دکھائی ہے اور ایک ایسا معیار دیا ہے جس پر پورا اترنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں رہ گئی۔

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ انہوں نے ادبی جائزوں کا سلسلہ جریدے "اوراق" سے شروع کیا جو روزنامہ "جنگ" لاہور' ہفتہ وار "ہماری زبان" نئی دہلی اور ماہ نامہ "صریر" سے ہوتا ہوا اب کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

کتاب کے شروع میں "صریر" کے مدیر ڈاکٹر فہیم اعظمی اور غلام الثقلین نقوی کے پیش لفظ اور مصنف کا

دیباچہ ہے۔ فہیم اعظمی نے جائزہ نگاری کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے علاوہ "صریر" میں شائع ہونے والے ڈاکٹرانور سدید کے سالانہ ادبی جائزوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ غلام الثقلین نقوی نے انور سدید کی جائزہ نگاری کا جائزہ لیا ہے جب کہ مصنف نے دیباچے میں اپنی جائزہ نگاری کی تاریخ اور عمل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد 1996ء کے ادب کا جائزہ "ادب کہانی" 1996ء کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔

مصنف نے جائزے کو "شاعری" اور "نثر" کے بنیادی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں "شاعری" کے تحت نظم، غزل، ہائیکو، ترائی لے، سانیٹ، ماہیا، دوہا، گیت، اخذیات، رباعی، دینی شاعری، مرثیہ اور نثری نظم کی اصناف میں ادبی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں "اردو نثر" کے تحت افسانہ، ناول، انشائیہ، طنز و مزاح، سفر نامہ، تنقید شخصیت و خاکہ نگاری، سوانح و خودنوشت، یادنگاری، اقبالیات، غالبیات، خطوط، اداریے، رسائل، کالم اور ملاقات کی اصناف میں تخلیقات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "مرحومین" کے عنوان سے 1996ء میں وفات پانے والے ادباء کا ذکر ہے، "من آنم" کے تحت مصنف نے 1996ء کے دوران اپنی قلمی کاوشوں کا ذکر کیا ہے اور "تعارف نامہ" کے تحت اپنے ضروری کوائف پیش کئے ہیں۔ اردو میں ابھی اس کا چلن نہیں، لیکن میرے خیال میں ایک کتاب میں مصنف کے متعلق یہ ضروری معلومات ضرور ہونی چاہئیں۔

اپنی اہم تصنیف "اردو ادب کی مختصر تاریخ" کی طرح مصنف نے اس ادبی جائزے کو بھی پر مغز بنا دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے 1996ء کی ادبی تخلیقات کا علم تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ بعض اہم تحریروں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے جس سے ان تخلیقات کے ادبی مرتبے کا تعین بھی ہوتا ہے، یوں یہ کتاب محض کتاب شماری تک محدود نہیں رہی، اچھی خاصی تنقیدی تصنیف بن گئی ہے۔ مصنف کا ایک اور کمال یہ ہے کہ انہوں نے جائزے میں صرف کتابوں کا ہی ذکر نہیں کیا، رسائل کے اہم مضامین و مقالات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے جائزے کے دوران تخلیقات کے بارے میں جو آرا دی ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ان تخلیقات کا مطالعہ کر کے اور کسی نتیجے پر پہنچ کر یہ رائیں لکھی ہیں۔ اول تو ایک سال کے دوران شائع ہونے والی سینکڑوں تخلیقات کا مطالعہ ہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں، پھر ان میں سے قابل ذکر سینکڑوں تخلیقات پر تنقیدی رائے لکھنا اس سے بھی کٹھن اور صبر آزما مرحلہ ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مصنف ان مراحل سے بہ خوبی نکل آئے ہیں۔ حیرانی ہوتی ہے کہ ادب کی کساد بازاری کے اس دور میں جب "ادیب" کے لئے مطالعہ چنداں ضروری نہیں رہا، 1996ء کے ادبی جائزے کے مصنف کی نظر سے وہ ساری تخلیقات گزری ہوں گی جن کا ذکر کتاب میں موجود ہے اور مصنف نے انہیں پڑھ کر رائے بھی دی ہو۔ محترم سجاد نقوی کی ان کے بارے میں یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ:

> "ڈاکٹر صاحب سال کے سال جس محنت اور جاں کاہی سے "ادب کہانی" لکھتے ہیں، میری نظر میں اردو ادب پر یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے"

خواب ساتھ رہنے دو

مصنف : اخلاق احمد

ناشر : امیج میکرز پریس چیمبرز' چندری گر روڈ' کراچی

قیمت : 100 روپے تبصرہ: الف۔ جیم.

اگر ابتداء میں چھپی ہوئی اخلاق احمد کی نظم (جس پر ان کا نام نہیں) پہلے پڑھ لی جائے تو مجموعے میں چھپی ہوئی گیارہ کہانیاں ___ (دس کہانیاں اور مصنف کا ابتدائیہ) زیادہ رلاتی ہیں۔ کہانیاں پڑھ کر نظم کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے' آپ بھی اسی کیفیت سے سرشار ہیں' اسی آزار میں گرفتار ہیں۔ کتاب کا انتساب بھی ایک اور کہانی ہے ____ محبت کے نام ____!

خواب ساتھ رہنے دو
خواب ہی سکھاتے ہیں
ہم کو زندگی کرنا _____
وصل میں اداسی اور
ہجر میں خوشی کرنا

گریہ اہل محبت کا شیوہ ہی نہیں' مسلک ہے اور یہ سلسلہ تصوف اور رومانیت سے جا ملتا ہے۔ جب محبت کا شعلہ دھیمی دھیمی آنچ بن جاتا ہے اور جب دل کا ہر جذبہ تھکا تھکا سا احساس بن جاتا ہے' تب یادیں ہی سیراب کرتی ہیں اور یادیں ہی اضطراب دیتی ہیں--- ارد گرد' آس پاس' چار چفیرے کیا ہے' بلکہ کیا کیا ہے' یہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ صرف محب اور محبوب کے درمیان رابطے کی زنجیر بندھ جاتی ہے۔ جو ٹوٹتی بھی نہیں' چھوٹتی بھی نہیں---- توڑنا آپ اس لئے چاہتے ہیں کہ دنیا داری اپنی طرف کھینچتی ہے اور چھوڑنا آپ اس لئے نہیں چاہتے کہ زندگی کی محرومیوں کی یہ دلکشی بھی چھن گئی تو باقی کیا رہ جائے گا۔

کہانی اور افسانے کے لئے نقاد بہت تاویلیں دیتے ہیں' اہل نظر بہت دلیلیں پیش کرتے ہیں' مگر تجریدیت ہو' روایتی اسلوب ہو' واقعاتی انداز ہو یا وارداتی مزاج۔ کہانی وہی ہوتی ہے' جو روح و جاں میں اتر جائے--- بہت پہلے شفیق الرحمٰن نے اردو ادب میں سلگنے اور مچلنے کے اس اسلوب کو روشناس کروایا تھا۔ "پچھتاوے" اور "برساتی" جیسی لازوال تحریریں اس وقت اور بھی یاد آتی ہیں جب آپ "بدنصیب" اور "کہانی پیچھے رہ جانے والوں کی" پڑھتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے صحافت نے اخلاق احمد کے اندر کے شاعر کو مارا نہیں--- جس طرح فیض اور ساحر کی نظمیں بے ساختگی اور وارفتگی سے تڑپا کر رکھ دیتی ہیں' بالکل اسی طرح اس مجموعے کی کہانیاں آپ کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لاس اینجلس میں' پچھلے سال ایک مشاعرے کے بعد' ایک نہایت خوبصورت خاتون نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام کر داد دی--- آپ کی نظم سن کر تخلیق میں چھپا ہوا افسانہ "بدنصیب" دل و دماغ میں گونج اٹھا ہے۔ دونوں میں زندگی کی بے چارگی اور مجبوری کی جو کسک ہے' وہ بے چین کر دینے والا لطف دیتی ہے۔

میں دیر تک (بلکہ آج تک) سوچتا رہا--- یہ داد کسے ملی تھی۔ میرا خیال ہے ___ اخلاق احمد کی کہانی ہی کو ملی تھی۔

"باؤ وارث کی گمشدگی" کراچی میں پھیلی ہوئی برسوں کی دہشت گردی' ویرانی اور مارا ماری کے تناظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے' مگر اس کا اختتام بھی اسی بازگشت کے ساتھ ہوتا ہے' جس میں کس مپرسی اور بے کسی کی دہائی ہے یا شاید دبی دبی آہ ہے---- گنگا بھی ایک ایسی کہانی ہے جو تحیر کے ساتھ ساتھ تغیر کی نوید بھی دیتی ہے۔

بلاشبہ ____ بہت عرصے بعد اتنی شگفتہ' تابندہ اور زندہ و پائندہ کہانیوں کا مجموعہ سامنے آیا ہے--- اخلاق احمد نے اسے مڈل ایج والوں کی کہانیاں کہا ہے' مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسے نوجوانوں کو ضرور پڑھنا چاہئے کہ اس عمر کے الجھاؤ اور تناؤ کیا ہوتے ہیں' اور وہ جو اس عمر میں ہیں' انہیں یہ کہانیاں اس لئے پڑھنی چاہئیں کہ بے بسی کی یہ چاشنی اور کہاں ملے گی۔

مفتی جی

مصنف : ابدال بیلا

ناشر : فیروز سنز لاہور

قیمت : آٹھ سو روپے تبصرہ: الف۔ جیم

کل پرسوں افتخار چوہدری آئے' کہنے لگے۔ غازی عباس علم دار آئے تھے۔ آپ کے لئے "یہ" پیغام دے گئے ہیں ___ میں نے کہا ___ گلزار فاطمہ ان کی ماننے والی ہے۔ ابھی چند دن ہوئے بی بی پاکدامناں میں منت کا علم چڑھا کر آئی ہے۔ چوہدری صاحب نے اسی روانی میں کہا ___ اسے بھی کہنا۔ حاضری دے آئے سلام کر آئے ___ بعد میں داتا دربار بھی جائے' آپ بھی جانا-----

میں سب سنتا رہا۔ افتخار چوہدری کو ایک زمانے سے جانتا ہوں۔ انہوں نے پبلشنگ اور "ادب لطیف" کو عرصے سے چھوڑ رکھا ہے اور فقیروں' باباؤں اور قلندروں سے ناتا جوڑ رکھا ہے۔ سالہا سال کے اس تواتر میں وہ جب بھی آتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لے کر نہ جانے کس کس صاحب کشف و کرامت بزرگ کی حاضری کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے اپنے مکالمے کا احوال بیان کرتے ہیں۔ ان کے "آرڈر" سناتے ہیں۔ سیاسی حالات پر اور سیاسی کرداروں پر ان اولیاء کی مہربانیوں اور ناراضیوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ میں ان کی کسی بات کا نہ اعتبار کرتا ہوں' نہ انہیں یاد رکھتا ہوں۔ میں ان باتوں کو سوچ کی اس لہر سے ملاتا ہوں' جو ڈیروں پر جانے والوں کی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے--- اسے دنیا داری کے لفظوں میں بہکنا کہہ لیں یا جذب کا نام دے لیں جب یہ حالت شدت اختیار کر جاتی ہے تو ایسے لوگ مجذوب بھی ہو جاتے ہیں۔

مگر اب کے عجیب ہوا ____ گلزار فاطمہ کو یہ بات میں نے دلچسپی کے لئے سنائی ___ اس نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے کہا۔ اسے مذاق نہ سمجھیں۔ ایسا ہوا ہو گا وہ اس وقت روزے سے تھی اور اس پر الوہیت طاری تھی میں خاموش ہو گیا---

اور پھر___ اب جو سرد رات کے اس آدھے پہر میں' میں نے "مفتی جی" کے ورق پلٹنے شروع کئے تو مجھے ابدال بیلا کی باتیں بھی بالکل افتخار چوہدری جیسی لگیں اور مجھے اس روزے دار لڑکی گلزار فاطمہ کی بات ٹن ٹن کر کے

بجنے لگی۔ "اسے مذاق نہ سمجھیں"۔

ماننا ___ محبت کرنا اور عقیدت رکھنا عجیب معاملہ ہے ___ ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ممتاز مفتی سے کس کس کا تعلق نہیں رہا ___ پچھلے کئی سال سے انہوں نے جو نئی کہانی لکھی۔ "تخلیق" کو بھیجی ___ ساتھ کبھی چار سطروں کا خط لکھا ___ کبھی صفحہ بھر کر ___ لاہور میں آتے تو اشفاق احمد' بانو قدسیہ اور پروین عاطف نے کسی ادبی نشست کا ڈول ڈالنا چاہا تو مفتی جی بھڑک اٹھتے __ جن ایک دو ___ واقعتاً" ایک دو لوگوں سے ملنے کا ذکر کرتے' ان میں میرا نام بھی ہوتا ___ مگر میں نے انہیں صرف افسانہ نگار یا ادیب ہی جانا ___ نہ ان کے اندر جھانکا نہ ٹٹولنے کی کوشش کی۔ "لبیک" پڑھی تو محسوس ہوا' وہ قدرت اللہ شہاب کو مرشد مانتے ہیں اور کسی وقت ترنگ میں آکر خدا سے بھی جا ملاتے ہیں---

میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہے-----؟ میں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح بھٹکا ہوا آدمی ہوں' مگر کچھ عرصے سے اقبال کے خیال کے مطابق اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی کوشش میں ہوں۔

"مفتی جی" ملے' تین ماہ ہو گئے ہیں۔ اس دوران ابدال بیلا سے فون پر بات بھی ہوئی۔ کتاب کو جستہ جستہ دیکھا' تو ابدال بیلا کی کیفیت بھی چوہدری افتخار جیسی پائی۔ میڈیکل ڈاکٹر اور فوج میں کرنل ہونے کے باوجود اتنا سادہ' اتنا جھلا اور اتنے کچے "ایمان" کا ___ کہ اپنے مرشد کے لکھے ہوئے لفظ کے ایک نقطے کو بھی یوں چومتا ہے جیسے یہی نور کا دھارا ہو۔ یہ عشق کا کمال اور عقیدت کی معراج ہے۔ ابدال بیلا بتاتے ہیں کہ ممتاز مفتی تو روحانیت اور تصوف میں قدرت اللہ شہاب سے کہیں بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے لئے وہ وقت کے کسی صوفی کی سند میں لاتے ہیں۔

ٹن ٹن ___ ذہن میں پھر ایک چوٹ پڑ رہی ہے۔ "اسے مذاق نہ سمجھیں" دل پسیج جاتا ہے' کم بخت ذہن ہی عیار ہوتا ہے' شاطر اور چاتر ہوتا ہے۔ سو حیلے بہانے اور مین میخ نکال لیتا ہے ___ دل کہتا ہے' سوچو ___ جس شخص نے سولہ سو صفحے کی یہ کتاب مرتب کر دی ہے' وہ بھوندو تو نہیں۔ اس نے کچھ دیکھا' جانا اور محسوس کیا ہے' تو یہ کام کیا ہے۔ یہ جتن کیا ہے' یہ عذاب بھوگا ہے۔ وہ اس کیفیت سے گزرا ہے' اس حالت کو بسر کیا ہے۔

پڑھنے والو۔ "اسے مذاق نہ سمجھیں ___" یہ کتاب پڑھیں ممتاز مفتی کے ساتھ ساتھ ابدال بیلا کو بھی پڑھیں۔ کہیں سے مانگ کر ___ بے شک چرا کر ___ کہ یہ چوری گناہ نہیں ہو گی۔

کھویا ہوا سا کچھ

شاعر : ندا فاضلی

بصر : کیول سوری

صفحات : 140 قیمت : 100 روپے

ناشر : معیار پبلی کیشنز' 302 K' تاج انکلیو' گیتا کالونی' دھلی 110031-

ندا فاضلی کی شاعری کا یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے "لفظوں کا پل" "مور ناچ" "آنکھ اور خواب کے درمیان" شائع ہو چکے ہیں جن میں شامل بیشتر تخلیقات شاید امتداد وقت کے ساتھ کاغذ پر تو اتنی تابناک نہ رہیں لیکن اس کے قارئین کے ذہن میں ہمیشہ شاداب اور تروتازہ رہیں گی۔

ندا کی شاعری کو بلا جھجک ہمہ جہت کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بہت سے پہلو شعور کے دریچوں پر بہ آواز بلند دستک دیتے ہیں۔ اس کی سوچ اور اظہار کے دلپذیر پیکروں میں دھنک کے سارے رنگوں کی آمیزش ہے۔ تاہم اس کا ایک نمایاں رنگ یہ بھی ہے کہ اسے لفظوں کو برتنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس کی شاعری کا یہ سلیقہ کبھی کبھی لفظوں کو ایسے نئے معنی دیتا ہے کہ ان سے شناسائی ہوتے ہوئے بھی بے اختیار ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ تو کوئی نئی بات ہے۔ اس کی شاعری میں ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی لیکن یہاں میں صرف اس شعر کا ذکر کروں گا جو زیر نظر مجموعے کے انتساب کا حصہ ہے:-

"بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گزر کیوں نہیں جاتا"

بیت جانا یا گزر جانا مترادفات ہیں۔ لیکن یہاں گزر جانا بیت جانا سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہاں بیتی بات نقش بر آب نہیں بنتی کیونکہ بیت جانے کے باوجود وہ ابھی گزری نہیں' اس کے وجود کا حصہ بن کر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

ندا فاضلی کا یہ شعر پڑھ کر میرے ذہن میں فیض احمد فیض کا یہ شعر گونجنے لگا۔

"گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے"

جب تک یہ شعر نہیں پڑھا تھا' میرے لئے لفظ کاروبار ایک ایسا غیر شاعرانہ لفظ تھا جو سوچ کو لوہا منڈی یا کباڑی بازار کے بیزار کن ماحول کی طرف تو لے جاتا تھا' شاعری کے ان دیکھے' خوابناک جزیروں کی طرف نہیں۔ لیکن یہ شعر پڑھنے کے بعد کاروبار کا مفہوم ہی بدل گیا اگرچہ لغت میں اس کے معنی اب بھی وہی ہیں' جو پہلے تھے۔

ندا کی شاعری ایک اور بات کی طرف بھی بڑا واضح اشارہ کرتی ہے کہ بیک وقت حال اور مستقبل میں سفر کرنے کے باوجود اس کا رشتہ اتیت (ماضی) سے بڑا گہرا ہے۔ اتیت کبھی پرکھوں کا رشتہ بن جاتا ہے اور کبھی ماں کی ممتا سے سرشار بچپن کی یادیں:-

"میری نظم
ایک منڈیر پر بیٹھے
کوؤں کے بیچ
بکھرے ہوئے چاولوں میں جڑتا ہوا پرکھوں کا رشتہ ہے"۔

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے! چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں

بانس کی کھری کھاٹ کے اوپر، ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں
بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

انسیت سے گہرے لگاؤ کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے:-

مل جل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی

ندا فاضلی کبھی صوفی سنتوں کے ڈیرے کا طواف کرتا نظر آتا ہے تو کبھی خود خدا بن کر دنیا کی از سرنو تشکیل کی ماورائی تمنا میں گم دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے ماحول اور گردوپیش سے بے خبر نہیں رہتا۔ اس کا ثبوت وہ اکثر دیتا رہتا ہے۔

کبھی اپنی نظم "ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی" کے روپ میں اور کبھی ان اشعار کے ذریعے:-

ہنستے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت
رونے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی

خون سے تر بتر، کر کے ہر رہگزر، تھک چکے جانور
لکڑیوں کی طرح پھر سے چولہے میں جل جو ہوا سو ہوا

اس مجموعے میں شامل دوہوں میں بھی قاری کو اپنی طرف کھینچنے اور اسے تسخیر کر لینے کی بھرپور صلاحیت ہے۔

زیر نظر مجموعے میں چند کمزور نظمیں بھی ہیں جو شاید کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لئے شامل کی گئی ہیں مثلاً "ایک افسانہ" جس کا آخری حصہ یعنی صفحہ 88 پر چھپی ہوئی عبارت تو بالکل ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے علاوہ "اپنا دیوتا" اور "فرق اگر ہے تو اتنا ہی" ندا فاضلی کی شاعری کے سانچے میں نہیں ڈھلتی۔

اگر آپ نے اس شعری مجموعہ کو پڑھنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میری ایک تنبیہہ یاد رکھئے گا۔ آپ چاہے اس کتاب کا ایک ایک حرف پڑھ جائیں لیکن مندرجہ ذیل نظموں سے آنکھ چرانے کی کوشش کیجئے گا:-

"چھوٹی سی ہنسی، حمد اور سپنا زندہ ہے"

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس بات کا خاصا خدشہ ہے کہ یہ نظمیں اپنے متن اور اندر بہت اندر اتر جانے والے اظہار کی وجہ سے آپ کے لئے ایک مستقل کسک کا باعث بن جائیں گے۔

انجمنِ خیال

(خطوط)

محبی و مکرمی اظہر صاحب!

ہدیہ تسلیم بصد تعظیم قبول فرمایئے۔ آپ کا خط ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ خاصا سکون بھی ہوا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں جو پھر کبھی سر راہے ضبط تحریر میں آ جائیں گی۔ آپ کے امریکا کے سفر سے افسوس بھی تھا اور خوشی بھی۔ افسوس یوں کہ جن دنوں آپ وہاں گئے' انہی دنوں میں لاہور گیا اور نیاز مندی کا شرف نہ حاصل ہو سکا۔ مگر خوشی یہ تھی کہ بالاخر آپ کو نکلنا ہی پڑا اور غیر ممالک میں خادمان اردو کی کوشش سے براہ راست واقفیت کا موقع ملا۔ اتنا اندازہ تو آپ کو بہرحال ہو ہی گیا ہو گا کہ وابستگان ادب اردو ہر جگہ اپنی مساعی میں مصروف ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان خدمات کا قرار واقعی اعتراف کئے جانے میں ذرا بخل کا شائبہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ میرا اپنا تاثر ہو جو ضروری نہیں کہ صحیح بھی ہو۔

نیر جہاں سے میرے اچھے اور مخلصانہ مراسم رہے ہیں۔ مجھے جو دو خط ملے ان میں ان کی شکایت زیادہ تھی آپ کا ذکر اسی حوالے سے آیا۔ ایک دوست نے لکھا ہے کہ نیر جہاں اور ان کے حواریئین نے ایک ادبی ٹولی بنا رکھی ہے جس کے پنجے پورے امریکا میں پھیلے ہیں۔ اگر اظہر صاحب اس ٹولی کی دعوت پر آئے ہیں / آئیں گے تو پھر عام ادیبوں اور شاعروں سے نہ وہ مل سکیں گے نہ انہیں غیر جانبدار اور آزاد خیال لوگوں سے ملنے دیا جائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر کوئی مہمان کسی مخصوص دعوت پر آیا ہے تو اسے میزبانوں کا خیال تو رکھنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ جو کچھ بھی شکایت ہو وہ مقامی حضرات سے کیجئے گا۔ اظہر صاحب سے کیا واسطہ؟ دوسرا خط ذرا اس لب و لہجے میں تھا جس کا ہماری ادبی قدروں سے بہت دور کا واسطہ تھا۔ انتہائی غیر شائستہ انداز میں نیر جہاں کی ادبی سے زیادہ ذاتی سرگرمیوں کا ذکر تھا۔ اس طرح کے خط میں عام طور پر تلف کر دیتا ہوں۔ ادبی و علمی جھگڑوں میں میں جم کر حصہ لینے کو تیار ہوں لیکن بات اگر ذرا بھی ذاتی اعمال و کردار یا خاندانی و تہذیبی پس منظر کی طرف مڑتی ہے تو میں پسپائی اختیار کرنا ہی قابل فخر خیال کرتا ہوں۔

اگر امریکا میں کہیں کسی کو کوئی شکایت ہوئی ہو تو آپ خود ہی میرے کلمات کو متعلقہ حلقوں کی طرف (جائز طریقے پر) منسوب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ذاتی طور پر مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ لندن میں نہ رکے۔ شاید شرف ملاقات حاصل ہوتا۔

کل آغا سہیل سے بات رہی۔ کرسمس کی وجہ سے فون سستا ہو گیا تھا میں نے ان کی خیریت پوچھ لی۔ ان سے یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ عبادت بریلوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ بالکل ہی غیر متوقع اطلاع تھی اس لئے فطری

طور پر افسوس زیادہ ہوا۔ عبادت بریلوی صاحب کی خودنوشت افکار میں چھپتی رہی۔ آپ نے ضرور پڑھی ہو گی لیکن یہ بات کم لوگوں کے علم میں ہے۔ خود بریلوی صاحب نے خود نوشت میں اس طرف اشارہ بھی نہ کیا کہ مرحوم نے پاکستان کی خاطر اور پاکستان کی محبت میں خاصے نقصانات جھیلے۔ ان کے ہم جماعت حبیب الرحمان صاحب لکھنؤ کے روزنامہ " قومی آواز" میں میرے ساتھ تھے۔ بعد میں وہ روس کی وزارت خارجہ سے متعلق ہو گئے اور غیر ملکی ادبیات کے شعبہ کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ حبیب صاحب کا انتقال ماسکو ہی میں ہوا۔ وہی کبھی کبھی عبادت صاحب کے بارے میں بتاتے تھے۔

تخلیق کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ لفافے پر مہنگے مہنگے ٹکٹ دیکھ کر بقول کسے ہوش اڑ گئے۔ یہ آپ ہی کا جگر ہے کہ رسم وفا نبھائے جا رہے ہیں۔ ورنہ دور وہ آگیا ہے کہ اچھے اچھے خلیق و خوش وضع حضرات بھی کس نمی پرسد کہ ـــ پر عامل ہو گئے ہیں۔

جن حضرات نے اس ننگ اسلاف کا ذکر فرمایا ہے ان کا انتہائی شکر گزار ہوں۔ انور سدید صاحب کی خدمت میں الگ سے چند سطریں نذر کر رہا ہوں کیونکہ انہوں نے ازراہ بندہ نوازی اپنے دولت کدے کا پتہ عطا فرمایا ہے۔ لیکن وہ آپ سے میرا پتہ حاصل کر کے براہ راست شرف رابطہ سے سرفراز فرما سکتے تھے۔ کیا شائع شدہ خط کا یہ مطلب ہے کہ میں آپ کے رسالے کے ذریعے ہی فخر نیاز مندی حاصل کروں؟ بہرحال ایک ذاتی عریضہ ارسال کر دیا ہے۔

ہاں زیر نظر شمارے میں لالی چودھری کی کہانی بہت قابل لحاظ ہے۔ خدا کے لئے برا نہ مانئے گا' کہنا پڑ رہا ہے کہ بہت دنوں بعد آپ کے معتبر و موقر رسالے میں ایک کہانی ایسی ملی جس میں "مبادیات کا احترام" فطری طور پر موجود ہے۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں

آپ کا قیصر تمکین (انگلستان)

"اپنی بات" میں حکیم سعید صاحب کے بے رحم قتل کا ذکر آپ نے بڑی دردمندی سے کیا ہے۔ واقعی وہ بے غرض' بے لوث' محب وطن' بے ریا' ذہین اور فطین شخص تھے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن' ہمدرد لائبریری' ہمدرد دوا خانہ اور ہمدرد یونیورسٹی کا قیام ان کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ ان کا ہر کام تعمیری اور ہر عمل نیک فعل تھا۔ میں نے حکیم احمد شجاع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا۔ اہل قلم کانفرنس میں میں نے ان سے گزارش کی کہ وہ اس مقالے کو ہمدرد فاؤنڈیشن کے تحت شائع کرائیں کیونکہ حکیم احمد شجاع سے ان کی خاصی دوستی تھی اور حکیم صاحب کئی بار "شام ہمدرد" کی صدارت بھی کر چکے تھے۔ انہوں نے یہ مقالہ ہمدرد فاؤنڈیشن کو بھجوانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ یہ مقالہ وہاں سے شائع ہوا۔ اس طرح میرے ہاتھ کا لکھا ہوا اس مقالے کا مسودہ بھی ہمدرد لائبریری میں محفوظ ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایسے مخلص اور فعال انسان کو بے گناہ قتل کر دیا جائے۔ اب تو ہمیں ایدھی صاحب کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ خدا ان کی حفاظت کرے۔

"دو ناولوں کی کہانی" بڑا فکر انگیز مضمون ہے۔ ریاض صدیقی نے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اپنے موضوع کو پیش کیا ہے۔ امریکہ کے ساتھ روسی حکمرانوں کی سازباز اور روسی سوشلسٹ نظام کے عارضی خاتمے سے اور پھر موجودہ دور میں

چینی حکمرانوں کا امریکہ کے ساتھ دوستی اور تعاون کا سلسلہ گیاتری کے پیش کردہ تھیسس کو درست ثابت کرتا ہے۔

قتیل شفائی' احمد ظفر' ناصر شہزاد' ندا فاضلی کے گیت اچھے ہیں۔ ان میں ہندی کے مانوس اور کومل الفاظ خوب لطف دیتے ہیں۔ کاوش عباسی کی نظم "ہم تو مرتے ہیں" بہت موثر ہے کیونکہ اس میں سامنے کی زندگی کا حوالہ موجود ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے جس طرح سرمایہ بنایا' ملک اور اہل ملک کو لوٹا' ان کا استحصال کیا---- یہ نظم اس کی مبنی بر حقیقت کہانی ہے۔ سیما شکیب' حیدر قریشی اور پرویز بزمی کے ماہیے اچھے لگے۔ ماہیے چاہے پنجابی میں لکھے جائیں' سرائیکی میں یا اردو میں ان کا تاثر اور سندرتا ایک جیسی ہے۔ نعیمہ ضیاء الدین کی نظم بھی پسند آئی۔ صبا جاوید اور نزہت انیس کی نظموں میں رومانی تاثر ہے جبکہ نعیمہ صاحبہ کی نظم میں حقیقت کی پرچھائیں ہے۔

امراؤ طارق کا افسانہ "چشم دید گواہ" عالمی صورت حال کو پیش کرتا ہے لیکن اس میں اپنے ملک کی کہانی بھی موجود ہے۔ البتہ افسانے کا خاتمہ عجیب سا لگا ہے۔ کیا 1965ء کی جنگ پاکستان کی جیت تھی اور اس لئے تھی کہ فوجی حکومت تھی' مارشل لاء تھا' پھر 1970ء کی جنگ بھی تو فوجیوں نے لڑی تھی۔ اس وقت بھی جمہوری حکومت نہ تھی۔ جنگ ہمیشہ مارشل لاء کے دور میں ہوئی۔ جمہوریت کے دور میں جنگ ابھی تک تو نہیں ہوئی۔ بعض جملے بڑے معنی خیز اور خوب صورت ہیں مثلاً "ہمیں غلامی کا طویل تجربہ ہے لیکن آزادی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں تو جہاں تک میں نے سنا ہے حکومت بھی خاندان غلاماں سے شروع ہوئی تھی"۔

"کہانی پیچھے رہ جانے والوں کی" ____ پرانے انداز پر لکھی گئی کہانی ہے۔ پرانی کہانی کی طرح دلچسپی تو اس میں قائم رہتی ہے لیکن موضوع کوئی خاص نہیں۔ مثالی اور رومانی رویہ غالب ہے پوری کہانی پر۔

نسیم سیفی' حسین شاہد' جگر جالندھری' شبنم منارووی' انوار فیروز' اعزاز احمد آذر' عابد انصاری' سجاد مرزا' شہناز مزمل' شوکت مہدی' محمد حسین کنول وغیرہ کی غزلوں کے بعض اشعار اچھے لگے۔

ڈاکٹر انور سدید کا مضمون لالی چودھری کے فن کا اچھا جائزہ پیش کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون کو خالص فنی نہیں بنایا بلکہ اس میں اپنے تاثرات کا رس بھر کر اسے ذاتی تاثر کا مضمون بنا دیا ہے جبکہ ڈاکٹر محمد عالم خان کا مضمون خالص تکنیکی سطح کا مضمون ہے۔ انہوں نے دو ٹوک فیصلہ دیا ہے کہ "وہ (لالی چودھری) بلاشبہ ایک بڑی افسانہ نگار ہیں"

لالی چودھری کا افسانہ "ایک لفظ کہ کشتنی" اچھا افسانہ ہے۔ انگریزی الفاظ کی بھرمار ہے لیکن امریکہ میں رہنے والی افسانہ نگار کا یہ رویہ غیر معمولی نہیں ہے۔ ماحول کے مطابق یہی زبان زیب دیتی ہے۔ افسانے میں بعض جگہ ماربڈ رومانٹسزم کا تاثر ملتا ہے جو امریکہ کے حقیقت پسند معاشرے میں فٹ نہیں بیٹھتا لیکن ایک ایشیائی کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اس افسانے کے موضوع کی خاصی تاویل کی ہے اور اسے حق بجانب قرار دیا ہے۔ مجھے بھی اس موقف سے اس حد تک اتفاق ہے کہ بیوہ تو ہمیشہ مظلوم کہلاتی ہے اور مطلقہ عورت کا کردار مشکوک بنا دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس افسانے کا انجام زبردستی کا لگا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا سفرنامہ نیپال نگری کے بارے میں دلچسپ ہے۔ پہلے تو تارڑ صاحب اپنے سفرناموں میں اپنے آپ کو یونانی مجسمے سے تشبیہ دلواتے تھے اب عمر بڑھ گئی ہے تو لیری کنگ سے مشابہت دلوانے لگے ہیں۔ لیری

کنگ تو سات آٹھ بیویاں بھگتا چکا ہے (واللہ عالم) چہرے مہرے بھی نہیں ملتے۔ ہمارے تارڑ صاحب زیادہ رعنا ہیں۔ بہرحال "جس کو دیکھا خمار میں دیکھا" پسند آیا۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے حسب معمول تخلیق 1997ء کی تحریروں کا جامع جائزہ لیا ہے۔ نارنگ ساقی نے کیول دھیر کی شخصیت کا خوب صورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس میں ان کی محبت اور عقیدت کا رنگ جھلکتا ہے۔ انجمن خیال حسب معمول بھرپور ہے۔

اے۔ بی اشرف (انقرہ

جناب اظہر جاوید!

تسلیمات! اکتوبر کا رسالہ ڈاکٹر اے۔ بی اشرف صاحب کی معرفت مل گیا تھا۔ آپ نے میرا مضمون شائع کیا۔ آپ کا بہت شکریہ۔ میں نے وہ رسالہ ڈاکٹر صاحب سے لے لیا ہے تاکہ میرے پاس ریکارڈ رہے۔

دسمبر کا پرچہ آپ نے براہ راست مجھے بھجوا دیا ہے۔ اس کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔ بعض حضرات نے میرے مضمون پر اچھی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ میں ان کی شکر گزار ہوں۔ میری حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ زیر نظر رسالے میں "اپنی بات" سے پتہ چلا کہ حکیم سعید صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مجھے بہت رنج ہوا کیونکہ حکیم صاحب مرحوم ترکوں کے لئے اجنبی نہ تھے۔ وہ کئی بار ترکی آئے اور انہوں نے ترکی کے بارے میں کتابیں بھی لکھیں۔ وہ ترکی اور ترکوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی کتاب "سعید سیاح ترکی میں" کے پہلے باب کا عنوان ہی یہ ہے کہ "ترکی ہمارا سچا دوست"۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں انہوں نے ترکوں کے باپ مصطفیٰ کمال کو خراج تحسین اسی طرح ادا کیا ہے جیسے ترک کرتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنے بے ضرر، بے لوث، محب وطن، روشن خیال اور بے حد فعال انسان کو بے رحمی سے مار دیا جائے۔ آخر کیوں؟ وہ تو انسانوں کی خدمت کر رہے تھے۔ کیا اس جرم کی سزا انہیں ملی ہے؟

"تخلیق" معیاری ادبی پرچہ ہے۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند ہے۔ آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔

اشرف صاحب آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔

مخلص ڈاکٹر سلمیٰ بینلی

نگران شعبہ اردو (انقرہ یونیورسٹی)

برادم اظہر جاوید صاحب

سلام مسنون، تخلیق کا 1998ء کا آخری شمارہ مل گیا ہے، اس مرتبہ آپ نے حکیم محمد سعید صاحب کو اس وقت یاد کیا جب وہ اس دنیا میں موجود نہیں، آپ ان کا ذکر ہمیشہ ان کی غیر حاضری میں ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ غیر حاضری دائم ہو گئی ہے۔ دنیا کا ظلم آشکار ہو گیا ہے۔ حق مغفرت کرے۔ ان کی وفات سے پورا پاکستان یتیم ہو گیا ہے۔ ان جیسا ایثار اب کسی شخص میں نظر نہیں آتا۔ وہ موت کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ قاتل واقعی ان کی زندگی کے درپے تھے۔ اور ایک چشم جودو سخا اور خیروبرکت بند کر دینا چاہتے تھے۔ قاتل بظاہر کامیاب ہو گئے لیکن حیات جاوداں حکیم محمد سعید صاحب کو ملی۔ قاتل روسیاہ ہیں، اور شاید تا حشر روپوش رہیں، ہمارے سرکاری ادارے تو

ان دہشت گردوں کو پکڑ نہیں سکتے۔

غالب دوراں اور شاعر شب نگار بنداں نے پھر مجھے یاد فرمایا۔ میں ان کے ارشادات عالیہ کا جواب متعدد مرتبہ دے چکا ہوں۔ اب اس کا تذکرہ بھی مناسب نہیں۔ البتہ آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ یہ "ورق دشنام آلود" مرسلہ تخلیق میں دو مرتبہ لگا ہے۔ میں نے اسے دو مرتبہ پڑھا۔ گویا میرے "گناہ" دو مرتبہ جھڑ گئے۔ شکریہ--- اب اتفاق دیکھئے جس بات کا افسانے میں ذکر ہی نہیں تھا اور جس پر مجھے ہدف دشنام بنایا گیا اس پر میرا معذرت نامہ اس اشاعت میں چھپ گیا ہے۔ بعض دوستوں نے غائبانہ طور پر طرفداری کا حق ادا کیا۔ میں ان کا بھی ممنون ہوں اور جمیل یوسف صاحب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سلسلہ دشنام جاری رکھیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

میں عادتاً" شکایات اور اعتراضات کے لیے آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں اور جو بات درست معلوم ہو اسے قبول کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ستر واں عبور کرنے کے بعد اب زندگی کے تھوڑے سے دن باقی رہ گئے ہیں۔ جن دوستوں کو اس ناچیز سے شکایت پیدا ہوئی ہے اور جن کا نام کسی جائزے میں نہیں آیا' وہ ازراہ کرم مجھے اطلاع کر دیں' میں ان کا ذکر کسی آئندہ جائزے میں کر دوں گا۔ بلکہ مناسب ہو گا کہ وہ اپنے بارے میں جو کچھ سننا پسند کرتے ہیں' مجھے لکھ دیں۔ میں ان کے حوالے سے مناسب طور پر جائزے میں شامل کر لوں گا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ممتاز افسانہ نگار عزیز احمد کے پہلے ناولٹ "مرمر اور خون" پر جو دیباچہ کتاب میں شامل ہے وہ مولوی عبدالحق نے نہیں لکھا تھا۔ بلکہ خود عزیز احمد نے لکھا تھا۔ مولوی صاحب نے اس پر صرف دستخط کیے تھے۔

اطلاعاً" عرض ہے کہ "تخلیق" ملنے پر قیصر تمکین صاحب نے میرے استفسار کا جواب براہ راست دے دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے نوبل ایوارڈز کے سلسلے میں آفتاب حسین کے ادبی اخبار میں بیان دیا تھا۔ یہ بیان میری نظر سے بھی گزر چکا تھا اور اتنا خطرناک نہیں تھا جتنا ناصر بغدادی صاحب نے رسالہ "بادبان" میں بنا دیا۔

بھائی! میں نے ایک مضمون حمیدہ معین رضوی پر لکھ کر آپ کی نذر کیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ "تخلیق" پر مضامین "اولوں کی طرح برستے" ہیں اور بعض مضامین کی اشاعت کی نوبت بڑی دیر سے آتی ہے۔ میرا یہ مضمون بھی ضرور لائن میں لگا ہوا ہو گا۔ اگر آئندہ پانچ سال تک اس کی اشاعت کا امکان موجود ہو تو اپنے پاس محفوظ رکھیے' میں وصیت کر رہا ہوں کہ میرے غیر مطبوعہ مسودے میرے ساتھ قبر میں دفن کر دیئے جائیں' میں انہیں اللہ تعالیٰ کے عالمی پرنٹنگ پریس سے چھپوا لوں گا۔ میں نے رحمٰن مذنب کا ایک انٹرویو آغا صاحب کو بھجوایا تھا۔ دو برس تک نہ چھپا تو شیخ سعید صاحب نے علامت کے لیے قبول کر لیا۔ میں تو اسے بھی اپنے ساتھ عقبیٰ میں لے جانا چاہتا تھا۔ حالات کے اس جبر اور ناشرین کی اشاعتی مجبوریوں کے تحت اب میں نے اپنی کتابیں خود چھاپنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ پہلا تجربہ "ادب کہانی 1996ء" کی صورت میں کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں پہلے ناشر سے کتاب چھپوا کر دوستوں سے منہ چھپایا کرتا تھا۔ دس نسخے کس کس کو پیش کرتا۔ اب افراط سے کتاب تقسیم کر رہا ہوں۔

افطار کے بعد شدید نقاہت سی ہو جاتی ہے۔ اس لیے اجازت دیں تو خط یہاں بند کر دوں۔ روزہ افطار ہونے والا ہے اور آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں' رفاقت علی شاہد نے میری کتاب پر بہت زریں اور بے حد تابندہ تبصرہ لکھا

ہے۔ میں اس کے سامنے شرمسار ہوں۔ لیکن آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس قدر تعریفی تبصرہ اشاعت کے لیے قبول کر لیا۔ البتہ اس تبصرے نے مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ اب مجھے رفاقت علی شاہد کے اسمائے تفضیل کی صفات پر اترنے کے لیے مزید محنت کرنا ہو گی۔

جائزہ 1998ء کی پہلی قسط حاضر خدمت ہے۔

والسلام مخلص' انور سدید

ڈیئر اظہر جاوید

اپنی بات کے تحت آپ نے انتہائی نیک جہت اداریہ لکھا ہے۔ حکیم سعید صاحب کا قتل صرف حکیم سعید کا قتل نہیں بلکہ پوری انسانیت کا قتل ہے۔ ادھر دیہاتوں میں بھی اس کا کرب اسی طرح سے محسوس کیا گیا ہے جس طرح سے کہ اس کی ضرب شہروں میں لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر لگی۔ پورا ماحول کئی دن تک ماتم کدہ بنا رہا اور لوگ کف افسوس ملتے رہے۔ کب تک یہ رویے روا رہیں گے ہمارے ساتھ' کب تک ہمیں کربلا کے اس صراط سے گزرنا پڑے گا' کب تک حق کی حمایت کرنے والوں کے سینے گولیوں سے چھلنی ہوتے رہیں گے۔ کوئی تو کچھ کہے' کوئی تو ہمارے ساتھ خون کے اس دریا میں بہے ..... کیول سوری کی نظم صدائے تیشہ' ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس نظم میں بھی رب جلیل کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ دھرتی سے انتہائے ظلم کو مٹائے اور اسے بسائے۔ نظم نے میرے دل کو انتہائی ارفع تقویت اور محویت سے مرصع کر دیا۔

"چلو مری جاں یہ فرض کر لیں
کہ فیض اس کا رواں دواں ہے
وہ آج پھر ہم پہ مہرباں ہے
تو سامنے اس کے سر جھکائیں
تو ہاتھ اٹھا کر دعا یہ مانگیں
کہ اس سسکتی بلکتی دھرتی پہ
اپنی رحمت کو عام کر دے

"کھیت" لطیف قریشی کو سچیت کر گئی ہے۔ ماہیا نے پرویز بزمی کو انتہائی "خود نگاہیا" بنا دیا۔ ٹھنڈی دعا کے ذریعے شاہین بدر بڑے خوش قدر رہے ہیں۔ سیما شکیب کا ماہیا "کچھ منہ سے نہ کہتے تھے' ہم ترے پہلو میں' دکھ ہجر کا سہتے تھے" پڑھ کر مجھے فراق صاحب کا یہ شعر یاد آگیا۔ رات آغوش میں تھا اور کوئی ___ دیر تک دل نے تجھے یاد کیا۔ آخر کار کے توسط سے خاور اعجاز خاصے کا مگار جا رہے ہیں۔ یاد "کو نزہت انیس نے اچھی طرح سے آباد کیا ہے۔ "ناقابل تردید" میں صبا جاوید نے قابل دید مصرعے لکھے ہیں۔ "تو اچھا ہے" کے واسطے سے نعیمہ ضیا الدین نے مصرعوں کی بجائے کرنوں کے لچھے پروئے ہیں۔ گیتوں کی ساری سبھا میں ندا فاضلی اول درجے کی کتھا پر قائم ہیں۔ سردار پنچھی کا گیت بھگتی تحریک کو عمدہ ذریعہ سے اپنا رفیق کر رہا ہے' خطوط میں انور سدید نے شری کیول سوری سے معذرت کر کے' ایک بڑا کارنامہ'

سرنامہ کیا ہے۔ مجھے انور سدید سے یہی امید تھی۔ پرویز بزمی اور حسین شاہد نے اپنے اپنے خطوط میں بڑی معرکہ آرا باتیں کہی ہیں۔ ادبی طور پر ہٹ اور فٹ ..... لالی چوہدری پر اظہر جاوید کا لکھا ہوا مختصر سا تعارفیہ جید بھی ہے اور جامع بھی۔ کوزہ میں دریا بند کرنے کے مترادف اپنی کیفیت اور ارفعیت کی بنا پر مربوط اور مضبوط۔ انور سدید نے لالی چوہدری کی افسانہ نگاری پر معیاری سطریں لکھ کر' افسانے کی جدید' حدود میں۔ لالی چوہدری کے وجود کو بڑی نیک نمود عطا کی ہے' محمد عالم کا لالی چوہدری سے متعلق یہ کہنا قطعی بجا اور روا ہے کہ لالی چوہدری ایک مکمل افسانہ نگار ہیں۔ یقیناً وہ کہانی کہنے اور لکھنے کا سلیقہ جانتی اور اسے پہچانتی ہیں اور یقیناً وہ اس ہنرمندی سے بھی آگاہ ہیں کہ موضوع اور مواد کو کس طرح فن کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ لالی چوہدری کا افسانہ "ایک لفظ کہ کشتنی' بہت ہی پختہ پشتنی افسانہ ہے' اس کا زمانہ اگرچہ مغربی نگارخانہ میں گھوم رہا ہے' مگر طلاق شدہ عورت کے لئے وہاں بھی وہی درجات' واردات ہیں جو یہاں مشرقی آستانہ میں اس کے لئے صراط ہیں۔ لالی چوہدری نے اس افسانہ میں بڑی نرم اور بڑی گرم زبان لکھی ہے' جو روح کی گہرائیوں تک رسائیاں حاصل کرتی چلی جاتی ہے۔ "ایسا سناٹا جو اپنی وحشت سے تنگ آکر کبھی کبھی بولنے لگ جاتا ہے" غالباً" میر انیس نے لالی چوہدری ہی کے خیال کو بہت پہلے یہ جمال' ارسال کیا تھا۔

یہ بے سبب نہیں خالی گھروں کا سناٹا
مکاں یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

"مجھے پہچانتی ہو ناں' زمانے کے ہر دور میں وجود کی ہر سطح پر ہم پہلے بھی ملتے رہے ہیں" کتنی کاٹ اور کتنا ٹھاٹھ ہے اس جملہ میں۔ کنول کا کردار' مشرقی عورت کے ہر سنگھار کو برقرار رکھے ہوئے ہے' مضبوط ..... مربوط ..... امٹ اور انیلا۔ جوگندر پال کا افسانہ لاشعوری طور پر مجید امجد کے ان دو اشعار کی ترجمانی انتہائی گوہر افشانی سے کر رہا ہے'

ایک سفر ہے صرف مسافت ایک سفر ہے جز و حیات
جینے والے یوں بھی جئے ہیں اک عمر اور زمانے دو
اور اب یہ کہتا ہوں یہ جرم تو روا رکھتا
میں عمر اپنے لئے بھی تو کچھ بچا رکھتا

"چشم دید گواہ" کے ذریعہ سے امراؤ طارق جنگ کے انتہائی غیر مبارک زمانوں کے پارکھ ہو رہے ہیں ان کا افسانہ اس شعر کو شوبھا بخش رہا ہے۔

انت' بے گھر لوگ' اجڑی بستیاں
منتی مت فیصلہ کر جنگ کا

ان کا یہ کہنا قطعی طور پر سچ ہے کہ 1965ء اور 1970ء کی جنگوں کے علیحدہ علیحدہ عکس ہیں۔ 65ء کی جنگ ہم نے اپنے بچاؤ کے طور پر لڑی تھی اور 70ء کی جنگ اپنی ہی قوم پر دباؤ کے تحت' "پہلی جنگ ہمارے لئے مہمان بنی اور دوسری باعث نقصان۔ "کہانی پیچھے رہ جانے والوں کی" کے تانے بانے اخلاق احمد نے انتہائی اعلیٰ ادبی پیمانے پر بنے ہیں۔ مکتی کی مہربان اور گنجان منازل سے گزرتے ہوئے اور اسے مجید امجد کے یہ دو شعر کافی سہانتا اور مہانتا عطا کر رہے ہیں۔

یہ جو ہے سر پہ گیان کی گٹھڑی
کھول کر بھی اسے کبھی دیکھا
رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس
پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا

پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا ..... یہ اتفاقیہ امر ہے کہ نووارد ان ادب کے ہمراہ ادب کے کہنہ مشق شعرا نے بھی بہت تازہ اور پرغازہ غزلیں کہی ہیں۔ اسرار زیدی' نسیم سیفی' جمیل ملک' جمیل یوسف' حسن اختر جلیل' (بطور خاص) بیدل پانی پتی پھر حسین شاہد' شبنم منارووی' انوار فیروز پھر بطور خاص جگر جالندھری اور حمیدہ معین رضوی اور پھر اعزاز احمد آذر' عاصی کاشمیری' اشرف سلیم' شاہدہ ناز' پروین کمار اشک' رشید نظر' شاہین فصیح ربانی اور جواد حسین' یہ سبھی نئے اور پرانے لوگ اس بار اردو غزل میں بڑے ہی سرشار شعر کہہ گئے ہیں۔ حمیدہ معین رضوی کا یہ شعر دیکھئے۔

پھول دریچے میں رکھ دو
سونا گھر ہے دل ویران

اس چھوٹی بحر میں بہت ہی پرلہر شعر ہے' بیدار سرمدی اپنے اس شعر پر نظر ثانی کر لیں وہ بس میں تھا وہ کیا۔ پھر بھی اپنا ہو نہ سکے' آنکھیں بے وفا اور دل ہے ناسپاس اپنا۔ انور سدید نے اس مرتبہ بھی تخلیق 1997ء میں چھپنے والی نگارشات کو بڑے بھرپور انداز سے لفظیات کے پارچہ جات سے گزارا ہے اللہ کرے وہ آئندہ سال بھی ان کمالات سے گزریں اور اس سے آئندہ سال بھی' اور زندگی کے آنے والے ہر آئندہ سال میں بھی۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی افسانہ نگاری پر نارنگ ساقی نے خاصا آفاقی مضمون لکھا ہے' یہ مختصر سا مضمون کیول دھیر کے ادبی اوصاف کو انتہائی صاف اور شفاف کر کے پیش کر رہا ہے' رفاقت علی شاہد' انور سدید کو عقیدت کے اعلیٰ سراج اور خراج پیش کر رہے ہیں۔ انور صاحب یقیناً اس کے مستحق بھی ہیں۔ ریاض صدیقی کا مضمون دو ناولوں کی کہانی میں' مہاسوت کے ناول "دروپدی" کی جانچ اور پرکھ خاصا اور پرخلاصہ طریقہ سے کی گئی ہے مضمون پڑھ کر ہم اس امر سے بھی آگاہ ہوئے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی کچھ اور وجوہات بھی تھیں جو ہمارے خیالات سے اب تک دور رہی ہیں۔ سرورق کی تصویر گمبھیر اور دل پذیر ہے۔

والسلام ناصر شہزاد' 17-12-98

پیارے اظہر!

دسمبر 98ء کے "تخلیق" میں ریاض صدیقی کی شمولیت میرے لئے دلی مسرت کا باعث ہوئی۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ اپنے حاصل مطالعہ کو عام کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ اس طرح وہ میرے جیسوں کو پڑھنے کی محنت سے بچا کر عالم بنا دیتے ہیں۔ میں نے برسوں پہلے انہیں پہلے' "طلوع افکار" میں اور پھر "منشور" میں پڑھا اور ان کا مداح بن گیا۔ اب تم انہیں "تخلیق" میں لے آئے ہو تو یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ شکریہ! ان کے مضمون "دو ناولوں کی کہانی" میں مندرجہ ذیل سطور میری اپنی سوچ کو تقویت دے گئیں:

"..... مراعات یافتہ اور حکمران طبقے جھوٹے واقعات گھڑتے ہیں۔ ان میں رومانیت اور ہیرو ازم کی

افیون ملاتے ہیں اور پھر تمام دستیاب وسائل خصوصاً" انتظامیہ اور ذرائع تعلیم و ابلاغ کے ذریعہ ان کو سربلند کر کے ان کی مسلسل تشہیر کرتے ہیں اور اس طرح وہ دانشوروں کے ایک طبقے کو بھی اپنے جادو کے فریب میں پھنسا لیتے ہیں....."

اس فریب دہی کے مظاہر دیکھنے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ابتدا وطن عزیز ہی سے ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہی کہ جس ملک کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن حکومت کے قبضے میں ہو اسے جمہوری کہلانے کا کوئی حق نہیں رہتا' باقی رہ گئے اخبارات تو سنا ہے کہ وزیراعظم خود یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ ملک کے آدھے اخبار حکومت کے ساتھ ہیں (کیا پریس کی اس سے زیادہ توہین ہو سکتی ہے؟ اور پھر اس بیان میں حکومت کی اپنی سبکی کا ظاہر ہے حکومت کو ادراک ہی نہیں) گویا تشہیر کے ذرائع میں پورا ریڈیو' پورا ٹیلی ویژن' آدھے اخبارات' خوشامدی صحافیوں کے کالم اور دروغ گوئی کے عادی حکمران اور افسر سب کچھ شامل ہے' برین واشنگ کی دن رات اتنی بڑی یلغار کے سامنے اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میرے ایک محبوب شاعر نے بیان دیا کہ ایٹمی دھماکوں نے ہمیں وقار بخشا ہے تو مجھے دکھ ضرور ہوا لیکن حیرت ہرگز نہیں ہوئی۔ اب انہیں کون بتائے کہ بین الاقوامی معاملات طے کرنے میں پورے عالم اسلام کی حیثیت اتنے ہی صفروں کے برابر ہے جتنے دنیا میں اسلامی ممالک ہیں۔ لیکن ہم بقول بلھے شاہ اس بات کے عادی ہو چکے ہیں کہ

جھوٹھ آکھیاں ای کجھ پجدا اے
سچ کھواں تے بھانبڑ مچدا اے

نصف صدی میں ہم نے ایک ہی مہارت حاصل کی ہے۔ حقائق سے آنکھیں چرانا اور خوش فہمی کے خوابوں میں مست رہنا۔

عالمی سطح پر یہی فریب کاری بی بی سی اور سی این این جیسے ذرائع ابلاغ کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنی جگہ پر خود مختار اور آزاد ادارے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ "خبر" کے معاملے میں وہ اپنے حکمرانوں کو بھی نہیں بخشتے۔ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کئی دفعہ ان کی وساطت سے وہ سچائیاں سامنے آجاتی ہیں جنہیں ظالم طبقات خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ ساری آزادی اظہار پہلے سے طے شدہ امور کے دائرے کے اندر رہ کر برتی جاتی ہے۔ طے شدہ امور میں سب سے اہم یہ ہے کہ تمام دنیا کی بھلائی امریکہ اور یورپ کی تقلید ہی میں مضمر ہے۔ اس فلسفے کی تشہیر وہ پاکستان ٹیلی ویژن کی طرح احمقانہ طریقے سے نہیں کرتے۔ باریکی' نفاست اور سلیقے سے ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بلا کے ذہین لوگ خرید رکھے ہیں۔ دنیا کے تمام "بڑے" لوگوں کے دل میں یہ خواہش مچلتی رہتی ہے کہ وہ صحافی انہیں انٹرویو کا اعزاز بخشیں۔ اپنے دوسرے دور اقتدار میں بے نظیر امریکہ گئیں تو قوم کو بڑے فخر سے بتایا گیا کہ لیری کنگ انہیں اپنے پروگرام میں مدعو کر رہا ہے۔ ڈیوڈ فراسٹ کے ساتھ ایک انٹرویو میں نے خود دیکھا تھا' بے نظیر انٹرویو تو جوں توں نباہ گئیں لیکن فراسٹ نے آخر میں مسکراتے ہوئے ایک "دعائیہ" جملہ کہ کر اپنی خباثت بھی ظاہر کر دی اور بے نظیر کو اس کی حیثیت بھی بتا دی "مجھے امید ہے کہ آپ مزید بیس برس برسر اقتدار رہیں گی۔ ایسے کہ بلاول

آپ کا وزیر خزانہ ہو گا" نواز شریف تو ان گرگوں کی ایک پھینٹی بھی نہیں سہ سکتے۔ ان کے پہلے دور اقتدار میں بی بی سی ریڈیو نے عالمی سطح کے سوال و جواب کے لئے نرسمہا راؤ اور نواز شریف دونوں کو دعوت دی تھی۔ دونوں کی تاریخیں بھی طے ہو گئیں۔ نرسمہا راؤ نے ڈٹ کر سوالوں کے جواب دیئے لیکن اپنی باری پر نواز شریف کوئی عذر بنا کر غائب ہو گئے۔ سچ پوچھو تو میں نے اس غیر حاضری پر سکھ کا سانس لیا تھا۔

مغرب کے بڑے اخبار اور رسالے بھی اس بدی میں برابر کے شریک ہیں۔ ان میں بھاری معاوضہ لے کر لکھنے والے ازقسم ہنری کسنجر دانشوروں سے خدا کی پناہ! پچھلے دنوں اس کے ایک مضمون کو بہت اچھالا گیا تھا۔ اس میں بظاہر تیسری دنیا کے مقروض ملکوں سے ہمدردی جھلکتی تھی لیکن دراصل آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو اپنا طریق واردات بدلنے کے لئے نئے گر بتائے گئے تھے۔ مغرب کی یونیورسٹیوں کے کچھ اساتذہ بھی یوں تو اقتصادی اور معاشرتی موضوعات پر عالمانہ کتابیں لکھتے ہیں لیکن بین السطور مقصد عالمی سامراج کو بروقت انتباہ کرنا ہوتا ہے کہ دنیا کے وسائل پر قابض رہنے کے لئے اب کیا طریق اختیار کرنا ہو گا۔ یہ کتابیں ایک طرف علم کے جویاؤں کی پیاس بجھاتی ہیں تو دوسری طرف عالمی استعمار کا کام آسان کر دیتی ہیں۔ اس طرح یہ علم مظلوم طبقات کو بہت مہنگا پڑتا ہے۔

ضمناً" "دی گاڈ آف سمال تھنگس" تو شہر کی لائبریری سے مل گئی تھی اور میں نے اسے سرشاری کے عالم میں پڑھا تھا۔ "دروپدی" کے ترجمہ کا پتہ ریاض صدیقی کے مقالے سے چلا ہے۔ اب اسے بھی تلاش کرنا ہو گا۔

آج سے کوئی تیس برس پہلے مجلّہ "اوراق" نے چند افسانہ نگاروں کو ایک سوال نامہ بھیجا تو ان میں (اس وقت کے افسانہ نگار) مجھے بھی شامل کر لیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کوئی ایسا موضوع ہے جو آپ کو کہانی لکھنے کے لئے ہانٹ کر رہا ہو؟ میں نے جواب میں لکھا تھا کہ عام سی حقیقت یہی ہے کہ انسان روٹی کھاتا ہے، لیکن دراصل (پاکستان جیسے ملکوں میں) روٹی انسان کو کھا جاتی ہے اور یہی موضوع مجھے ہانٹ کر رہا ہے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ میری تحریروں میں روٹی اور عشق میری سوچ کی دو اصطلاحیں ہیں۔ میں نے انہیں محدود اور لغوی معنوں میں نہیں برتا، اپنے ایک پنجابی مضمون میں اس وسیع مفہوم کو وضاحت سے بیان کیا ہوا ہے۔

سوال نامہ پر کرنے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد وہ کہانی بعنوان "ابتر" لکھی گئی اور پھر "اوراق" ہی میں شائع بھی ہو گئی۔ یہ تمہید اخلاق احمد کا افسانہ "کہانی پیچھے رہ جانے والوں کی" پڑھ کر باندھنی پڑی۔ ویسے تو دونوں کہانیاں ایک دوسری سے بہت مختلف ہیں، پھر بھی اجمل خان مجھے انہی لوگوں میں سے لگا جنہیں روٹی کھا جاتی ہے، "ابتر" کا مرکزی کردار افسانہ نویس تھا، اجمل خان مصور ہے، اس کی افسانہ نویسی اور اجمل خان کی مصوری دونوں کو رزق کی "آسائشیں" نگل جاتی ہیں۔ دوسرا اشتراک یہ ہے کہ دونوں فنکار گفتار کے غازی اور ارادے کے کمزور ہیں۔ وہ اپنی نام نہاد آرام دہ زندگیوں سے بیزار ہیں لیکن ان سے نکلنے کی جرات نہیں رکھتے۔ "کہانی پیچھے رہ جانے والوں کی" کو جو چیز اعلیٰ کہانیوں میں شمار کرنے کا سبب بنتی ہے وہ اجمل خان کی زندگی میں نازلی حسین کا آنا ہے۔ وہ باتیں تو بہت کرتا ہے لیکن دریا پار کرنے کے لے پلوں کا متلاشی رہتا ہے جو ہر جگہ اور ہر وقت موجود نہیں ہوتے۔ دوسری طرف نازلی حسین ہے جو اجمل خان کے وعظ سے ایمان حاصل کر کے تیر کر پار جا اترتی ہے۔ اس کے بعد وہ اجمل خان کے وعظ کا احسان

جس انداز سے اتارتی ہے اس سے کہانی اور نازلی حسین دونوں کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ریاض صدیقی کے مضمون اور اخلاق احمد کے افسانے نے دسمبر کے شمارے کو معیار کے لحاظ سے خاصا لفٹ کیا ہے۔

اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو اداریئے کے نیچے میرے دستخط بھی متصور کر لو۔ دستخطوں سے پہلے اقبال کا ایک مصرع لکھنا چاہوں گا جو اس کی ارض خواب کی تاریخ کا عنوان بن چکا ہے۔

قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

تمہارا حسین شاہد

اظہر بھائی

خلوص و نیاز! تخلیق کا تازہ شمارہ نومبر دسمبر 1998ء مل گیا' پڑھا اور پسند آیا۔ اس میں سب سے قابل ذکر چیز حسین شاہد کا خط ہے جسے آپ نے بڑے اچھے وقت پر چھاپا ہے۔ انہوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "سیاسی ہونا" الزام نہیں بلکہ اعزاز ہے' اور اس طرح آپ بھی شعر و ادب اور فکر و نظر کے بین العالمی دھارے سے جڑ گئے ہیں۔ شعر و ادب اور فکر و نظر کو سیاست' سماج' اقتصادیات' اور نظریئے سے بے دخل کرنے کی ہوائی جو اردو کے جدیدیت پسندوں نے چھوڑی تھی ان کے اپنے ذہن کی اختراع تھی۔ اینگلو امریکی جدیدیت پسندی بھی اردو کی جدیدیت پسندی سے بہت مختلف ہوا کرتی تھی۔ ترقی پسندیت سے اختلاف ضرور تھا مگر وہ ترقی پسند دشمن ہرگز نہیں تھی چنانچہ جن ترقی پسندوں نے ہیت' اسلوب اور تکنیک کی حد تک جدیدیت سے استفادہ کیا اور ترقی پسندیت کے تمام جملہ تقاضوں کو پورا کیا ان کو اینگلو امریکی جدیدیت نے رد نہیں کیا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ امریکہ اور انگلستان کے دانشوروں کی اکثریت کا ہمیشہ ہی یہ موقف رہا ہے کہ شعر و ادب معاصر سیاسی و اقتصادی اور نظریاتی منظر سے کٹ ہی نہیں سکتا ہے۔ ٹام پالن (Tom Paulin) نے اپنی کتاب مطبوعہ 1994ء میں اس موضوع کا بہت تفصیل سے احاطہ کیا ہے اور امریکی و برطانوی شعر و ادب کی تاریخ کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ دور قدیم سے لے کر آج تک جتنا بھی شعر و ادب لکھا گیا ہے اس میں سیاسی و اقتصادی اور تاریخی شعور ملتا ہے۔ اس نے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کے متعلقہ حوالے بھی دیئے ہیں اور اس بات کا بھی ثبوت پیش کیا ہے کہ جدیدیئے جو اپنی تخلیقات کو ذاتی غیرسیاسی اور غیرجانبدار کہتے ہیں اس میں بھی کسی نہ کسی کونے سے سیاسی اور نظریاتی شعور در آتا ہے۔ دیکھئے یہ اقتباس اسٹیفن ڈن (Stephen Dunn) کی ایک نظم سے جو اس نے 1998 میں کہی ہے۔ (مجموعہ کلام مطبوعہ نارٹن اینڈ نارٹن لندن 1998ء)

"and what swirls in them is controlled confusion, which each of us understands."

اس میں کنٹرولڈ کنفیوزن اور ایج آف اس انڈراسینڈس جیسے فقرے توجہ طلب ہیں۔ لمحہ فکریہ تو یہ بھی ہے جو مارکس کو دفنانے اور نظریئے کی موت کے بلند بانگ دعوے کئے جا رہے تھے اس کی پول پچھلے سال ان دنوں کھل گئی جب انگلستان اور امریکہ میں کمیونسٹ منشور کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کا آہنگ اتنا بلند ہوا کہ سرمایہ داروں کے اخباروں اور رسالوں نے بھی اس کو موضوع بنایا۔ (دیکھئے ایرک ہابس بام (Eric Hobs Bawm) کا مقالہ مطبوعہ گارجین لندن 14 اکتوبر 1998)۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا کی زبانوں میں جو شاہکار شعر و ادب لکھا گیا تھا اور لکھا جا رہا ہے اس میں

سیاسی و اقتصادی اور سماجی و نظریاتی شعور ہی نمایاں ہے۔ تاریخ میں اپنے دور کی نسبت سے ترقی پسندیت کب نہیں رہی ہے۔ یونان کے قدیم فلسفے میں بھی وہ نام ملتے ہیں جو اپنے دور میں ترقی پسند تھے۔ ترقی پسندیت بھی تن تنہا۔ وہ انداز فکر ہے جو ایک تسلسل کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتا رہا ہے۔ اس میں کبھی ٹوٹ (Break) نہیں آیا۔ اسی لئے ترقی پسند کی ترکیب ایک آفاقی اصطلاح ثابت ہوئی۔ اسے یہ ضرورت ہی نہیں ہے کہ اپنے ساتھ "نیو"۔ "پوسٹ" "پوسٹ پوسٹ"۔ "پیرا" اور "مینا" وغیرہ جیسے دم چھلے لگائے۔

اس حوالے سے آپ یقیناً بہت آگے ہیں اور صحیح سمت کی طرف ہیں۔ حسین شاہد صاحب نے جس طرح آپ کی ہمت افزائی کی ہے' لائق تحسین ہے۔ آپ تو ماضی' حال اور مستقبل میں سانس لے رہے ہیں باقی سب تو بس حال میں سانس لیتے ہیں اور حال میں ہی تمام ہو جاتے ہیں۔ پوسٹ مارڈنزم بھی حال کے اندر ہی قید ہے۔ اصل میں جو کچھ بھی ترقی پسندیت کی تردید میں ہے وہ سب کا سب نئی نوآبادیاتی سامراجیت کا حال ہے۔ جس چیز کو حسین شاہد نے (But that is Politics) سے منسوب کیا ہے تو یہ "دیٹ از پالٹکس" بھی تو نئی نوآبادیاتی اور سابق نوآبادیاتی سامراجیت ہی کے ایجنڈے کا حصہ ہے۔

ریاض صدیقی

محترم اظہر جاوید صاحب

سلام و خلوص

"شاعر" کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ "تخلیق" کے اشتہار پر نظر پڑی۔ بھئی اس کے پچاس سال پورے کر لینے پر میری جانب سے بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ کسی ادبی رسالے کا نصف صدی تک جاری رہنا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ ایسے کارنامے پر ہر ادیب اور شاعر کو فخر محسوس ہونا چاہئے اور واقعی مجھے آپ پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں جہاں اچھے معیاری رسائل کا کال پڑ گیا ہے وہیں پاکستان میں کئی ایسے رسائل ہیں جو ادب کی پرورش کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ جیسے ہر ادیب و شاعر کو پاکستان کے رسائل میں شائع ہونے کی للک ہونے لگتی ہے۔ "تخلیق" کے لئے اپنی چند تازہ غزلیں ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ آپ کو پسند آئیں گی۔ احباب کو واجبات کہیں اللہ حافظ۔

فقط ابراہیم اشک' ممبئی

محترم اظہر جاوید صاحب

احساس تشکر کے ساتھ سلام عرض۔ بے حد شرمندہ ہوں کہ آپ جیسے مخلص انسان کا شکریہ بروقت ادا نہ کر سکی۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں دو ڈھائی ماہ سے out of station تھی۔ 18 اگست کو بھوپال واپسی پر تخلیق نظر نواز ہوا۔ ماشاء اللہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ حقیقت عرض کر رہی ہوں کہ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ ماہ جون کے شمارے میں آپ کی اپنی بات دل کی بات نہ صرف کہہ دی بلکہ لفظ لفظ دل میں اتر گیا۔ کتنے نازک موضوع پر آپ نے کس قدر خوبصورتی سے قلم اٹھایا ہے۔ پڑھ کر مجھے جو محسوس ہوا بیان نہیں کر سکتی۔ بہت کم الفاظ میں بڑے سادہ انداز نے

بہت بڑی حقیقت کو ایکدم بے نقاب کر دیا ہے۔ اپنی آخری سطور میں محبت کی جو (Defination) آپ نے دی ہے بے حد خوبصورت ہے۔

رسالے کو اول تا آخر میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ کر ختم کیا کیونکہ رسالے کی کشش ہی ایسی تھی۔ حصہ نثر حصہ نظم کس کی تعریف کروں۔ بڑے دلچسپ نثری نمونے اور بہت معیاری کلام کا حاصل ہے آپ کا ماہنامہ تخلیق میری تمام تر بہترین خواہشات تخلیق کے ساتھ ہیں۔

آپ کی خدمت میں ایک نظم کرب اور ایک غزل روانہ کر رہی ہوں۔ اگر آپ کے معیار کے مطابق ہوں تو کبھی کسی شمارے میں انہیں بھی اشاعت کا موقع دیں۔ عنایت ہوگی۔

جو بات مجھے پہلے کہنا چاہئے تھی وہ اب کہہ رہی ہوں۔ ماہ جون کے شمارے میں اپنی غزل دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی مگر اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ اتنی سرعت کے ساتھ آپ نے اس غزل کو کس طرح شائع کر دیا اور یہی نہیں' رسالہ مجھ تک پہنچا دیا۔ کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟ حیرتوں کے یہ پہاڑ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھے۔ یقیناً آپ ہر طرح مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اجازت دیں۔

احقرہ صفیہ راگ

محترم تسلیمات

آپ کے پہلے رسالے کی وصولی کا شکریہ کا خط لکھا ہی تھا کہ خوشبو کے جھونکے کی طرح اگست کا شمارہ بھی ابھی ابھی حاصل ہوا۔ تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ اپنی بات پڑھ لی۔ رسالے پر سرسری نظر ڈال لی ہے۔ یقیناً اس کی آب و تاب بھی کم نہیں ہے۔ خط Post کرنے کی عجلت ہے۔ اٹل بہاری باجپائی کی نظم بھی اس میں شامل ہے۔ کیا خوب' واقعی شمارہ لاجواب ہے۔ تفصیلی مطالعہ کے بعد آپ کو دوبارہ شکریہ کا خط لکھوں گی۔

احقرہ صفیہ راگ (بھارت)

مجی اظہر جاوید صاحب تسلیم!

تخلیق کا دسمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ حکیم محمد سعید کے قتل کا سانحہ ناقابل برداشت ہے۔ آپ سے ان کے دیرینہ مراسم تھے' اس لئے آپ کا غم و اندوہ برحق ہے۔ میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں لیکن ان کی مرجع خلائق شخصیت کے بارے میں دوسرے لوگوں کے اتنے بیانات دیکھے ہیں کہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ صحیح معنوں میں مرد مومن تھے۔ بقول علامہ اقبال' "غالب و کار آفریں' کارکشا' کارساز" بلکہ ان کے بارے میں یہ بھی کہنا ممکن ہے کہ

خاکی و نوری نہاد' بندہ مولا صفات
ہر دوجہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اب میں اس معاشرے کے بارے میں کیا کہوں جو ایک بندہ مولا صفات کو گولیوں کی باڑھ پر رکھ کر بھون سکتا ہے۔ خدا ہی اپنا رحم کرے۔

انجمن خیال میں شامل خطوط میں نے بہت دلچسپی سے پڑھے۔ ڈاکٹر انور سدید کا یہ مشورہ بہت صائب ہے کہ "

تقاضے" میں جو کالم آپ تحریر کرتے ہیں، اس کو تخلیق میں مکرر شائع کردیا کریں۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے تو یہ نقش اول ہی رہے گا۔ انجمن خیال کو ہائیڈپارک سے تشبیہ دینا اچھوتا خیال ہے مگر میری رائے میں اس کو قومی پارلیمنٹ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہائیڈپارک میں سب اپنی اپنی کہتے ہیں مگر کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ جبکہ انجمن خیال میں ہر شخص کی بات سنی جاتی ہے اور اس پر اکثر ردعمل بھی سامنے آتا رہتا ہے۔ اس مرتبہ خطوط میں جمیل یوسف کا لہجہ بہت سخت بلکہ غیرشائستہ اور جارحانہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید سے اختلاف کرنا ان کا جمہوری حق ہے لیکن ان کی بزرگی اور ان کی ادبی فتوحات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جانا چاہئے۔

لالی چودھری کے افسانے کی بنت بہت مضبوط اور ان کا اسلوب بیان جاندار ہے، لیکن انہوں نے ایک پہلے سے طے شدہ مفروضے کو افسانے کی بنیاد بنایا ہے، جو میرے خیال سے درست نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں مطلوقہ اور بیوہ دونوں کو تقریباً ایک ہی زمرے میں رکھا جاتا ہے اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ بعض صورتوں میں تو بیوہ کا عقد ثانی بہت مشکل ہو جاتا ہے جبکہ مطلوقہ عورت کے نکاح ثانی میں اتنی دقت نہیں پیش آتی۔ ممکن ہے لالی چودھری نے کسی خاص واقعے سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا ہو لیکن سماج میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

انجمن خیال کے خطوط سے اندازہ ہوا کہ اکتوبر کے "تخلیق" میں کچھ بہت ہی خاص چیزیں شائع ہوئی ہیں۔ مگر اکتوبر کا شمارہ مجھے نہیں ملا اس لئے میں ان کے مطالعے سے محروم رہا۔ غزلوں کے جھرمٹ میں رشیدہ عیاں کی غزل سب سے الگ ہے اور قابل توجہ ہے۔

اس خط کے ساتھ ایک غزل اور اپنی کتاب کا ایک اشتہار بھیج رہا ہوں۔ شائع کر دیں گے تو آپ کی عنایت ہوگی۔ اگر آپ کے دفتر میں اکتوبر کے شمارے کی کوئی کاپی بچی ہو تو ازراہ کرم مجھے بھیج دیجئے۔ یہ شمارہ یقیناً پہلے آپ نے بھیجا ہوگا مگر مجھے نہیں مل سکا۔

امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔ والسلام

خاکسار نامی انصاری (بھارت)

جناب اظہر جاوید صاب! سال نو مبارک! آداب!

دسمبر 98ء کا تخلیق نظرنواز ہوا ___ شکریہ آپ کا کہ آپ نے ناچیز کو بھی یاد رکھا۔ حسب عادت آپ کے دل کی بات یعنی کہ اپنی بات پڑھی اور پہروں سوچتا رہا۔ بہرکیف اب ایک بات تو طے ہے کہ روشن خیال انسان دوست عوام کے حقیقی خیر خواہ دانش وروں کے لئے زمین تنگ کی جا رہی ہے۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ جناب حکیم سعید سے پہلے بھی کچھ دانشور تاریک راہوں میں مارے جا چکے ہیں جناب حکیم سعید کا قتل بھی شاید اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ آپ کس کس بے گناہ کی موت پر اظہار افسوس کریں گے۔ شقی القلب لوگوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔

جس ملک میں سپریم کورٹ کی مقدس عمارت پر حملہ ہو جائے، چیف جسٹس کو مارنے کی ہراساں کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہاں پر حکیم سعید قتل ہو جائے تو حیرت کیسی؟

میرے خیال میں انسان دوست لوگوں کو اب یہاں سے کوچ کر جانا چاہئے۔
خواب اور عذاب کے افسانے' ڈاکٹر انور سدید کی تحریر اچھی اور دلچسپ بھی ہے۔ جناب ناصر شہزاد جناب سردار پنچھی کے گیت پسند آئے۔ امید کہ عراق کے خلاف امریکہ برطانیہ کی جارحیت کی مذمت کریں گے آپ۔
نیازمند محمد حسین کنول

برادرم اظہر جاوید صاحب
السلام علیکم! حیدر قریشی صاحب نے میرے بارے میں فرمایا ہے

1- میرا خط نہ چھپنا اس لئے اچھا رہا کہ اردو ماہیے کو پرویز بزمی جیسا ماہیا نگار مل گیا ہے۔
2- پرویز بزمی کے ماہیے پڑھ کر اس لئے خوشی ہوئی کہ "یہ واقعی ماہیے ہیں"۔
3- پتہ نہیں پھر ہم دونوں کے درمیان جھگڑا کیا تھا۔

حیدر قریشی صاحب کو شاید علم نہیں کہ پنجاب کے دیہات کا رہنے والا ہر شخص عمر کے کسی نہ کسی حصے میں ماہیا ضرور کہتا ہے۔ اس لئے میں نے اگر ماہیے کہے ہیں تو ایسا کون سا معرکہ سر کر لیا ہے۔ ان کا خط چھپ بھی جاتا تب بھی میں نے یہ ماہیے کہنے تھے کہ ماہیے کی اصل ہیت سامنے آئے۔ میرے ماہیوں کے بارے میں انہوں نے سرٹیفکیٹ دیا ہے کہ یہ واقعی ماہیے ہیں۔ شکریہ قریشی صاحب! آپ واقعی اس قسم کا سرٹیفکیٹ عطا فرمانے کا حق رکھتے ہیں۔ ماہیے کی اتھارٹی جو ٹھہرے۔ براہ کرم یہ بھی بتا دیں کہ اگر میرے ماہیے واقعی ماہیے ہیں تو پھر آپ کی کتاب میں مطبوعہ آپ کا یہ "ماہیا" کیا چیز ہے۔

"تھوڑی سی کہانی ہے
انسان کی طوطا
چشمی کی کہانی ہے"

آپ نے جھگڑا سمجھ لیا۔ میں نے تو صرف اتنی گزارش کی تھی کہ ماہیے کی اصل ہیئت اپنا لی جائے تو "طوطے کی چشمی" سے بچا جا سکتا ہے۔ مثلاً"

"تھوڑی سی کہانی ہے
انسان کی طوطا چشمی کی کہانی ہے"۔

اظہر بھائی! ایک طویل عرصے سے آپ کچوکے لگا رہے ہیں۔ مسلسل رلائے جا رہے ہیں۔ ہمدرد پاکستان کا قتل پاکستان کے اکلوتے مکمل انسان کا قتل ہے۔ حکیم سعید کے بعد باقی کیا بچا ہے۔ صرف ادھورے انسان۔ شاید کوئی صدی بار آور ہو جائے۔ بانجھ صدیاں حکیم سعید جیسا مکمل انسان کہاں سے لائیں گی۔ اگر اسی طرح رلانا ہے تو خدا کے لئے " اپنی بات" ختم کر دیں۔ مکافات کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ ڈور کھینچی جا رہی ہے۔ اب خاموشی سے وہ سب کچھ دیکھتے جائیں جسے دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔
اس بار تخلیق کی ہر چیز انتخاب ہے لیکن "پنجاب رنگ" سب پر بھاری ہے۔ یاسمین نشاط کا "سوال" ارشد

ملک اور نظر ملک کی غزلیں بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ نظر ملک نے کیا خوبصورت شعر عطا کیا ہے

ساری رات پر ہیں دے اندر گل چتھیندی رہی
چنبے دے پھل سوہنے ہن کہ تیرے دند بہوں

ارشد ملک کا یہ شعر تو اپنی مثال آپ ہے

چھنکی ناں کوئی ونگ ناں ہاسا کوئی پیا
تاء ٹھر گیاسی یا کتے چنگاں گزر گیاں

والسلام نیاز مند

پرویز بزمی

ڈیئر اظہر جاوید

نیا سال مبارک ہو' محبتیں' جب سے گئے ہو امریکہ میں کسی نہ کسی حوالے سے تمہارا ذکر رہتا ہے' یاد آتے ہو' احباب تمہاری باتیں کرتے ہیں۔ لالی چوہدری پر گوشہ شائع کر کے تم نے کمال کر دیا۔ انور سدید اور عالم خان کے دونوں مضامین بہت خوبصورت ہیں۔ پچھلے شمارے میں اکتوبر والے میں فرتاش سید اور منور سلطانہ کی غزلیں بہت خوبصورت تھیں۔ یار ایک بات بتاؤ پاکستان کا معاشرہ کیا ہے۔ یہ نفاست اور ثقافت کیا بلا ہے۔ شاعر اور ادیب کی آنکھ تو Spy Eye ہوتی ہے جو چیز عام آنکھ نہیں دیکھ سکتی وہ Spy Eye دیکھ لیتی ہے۔ ہم کب تک ان تمام سچائیوں پر کبھی نفاست کا نام لے کر اور کبھی ثقافت کا نام لے کر پردہ ڈالتے رہیں گے۔ میں ناصر شہزاد صاحب کا عرصہ سے معتقد ہوں کہ جیسا Gewrt انہوں نے اردو ادب میں کہیں نہیں رکھا ہے' وہ ابھی تک امیر خسرو کے بعد ایسی زبان میں کسی نے نہیں لکھا کم از کم اس جدید دور میں تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا ___ اتنی دیر سے لکھنے کے باوجود ایسا کیوں ہوتا ہے جب کوئی نئی زبان یا تراکیب استعمال کرتا ہے تو ہم فوراً ڈر جاتے ہیں یا تو ہم دماغ پر زور دینا نہیں چاہتے یا ہم کسی of Iqnorace Well میں رہنا چاہتے ہیں ہمیں اردو زبان اور اس کے قاری کی "باکریت" وہ بھی Socalled کو اب ختم کرنا چاہئے تاکہ یہ زبان بھی ادب اور زبانوں کے ساتھ آگے بڑھ سکے ورنہ زبان صرف انجمن ترقی اردو تک محدود رہ جائے گی۔ عبدالقیوم کراچی نے تو ایک فتویٰ صادر کر دیا کہ یہ حیوانی زندگی گزارنے والے انسانی ہمدردی کے مستحق نہیں اور اردو دان طبقے کو اس لغت میں اپنا ہمنوا بنانے کی جسارت کیسے کی۔ یہ اردو ادب کے قاری اور ادیب Helen Keller کی طرح اندھے بن کر کب تک بیٹھے رہیں گے۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ میں کافی عرصہ سے اس بونوں کی جائز اور ناجائز بے علم تنقیدیں سنتا آرہا ہے Enough is enough کوئی گورا ویسٹرن ہو گا تو اس کی نظمیں اور کہانیاں فخر سے پڑھیں گے۔ چاہے وہ اپنے دیس کا سب سے بڑا Gay کیوں نہ ہو جیسے Shakespear 'Waltwhit man William اور Allen Ginzburg ___ اور اگر کوئی دیسی ادیب یا شاعر لکھ دے تو ان کے اندر کی جھگڑالو عورت فوراً اسلام کا سہارا لے کر باہر نکل آتی ہے ایسے جاہل قاری پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں جبکہ MTV اور CNN پوری دنیا میں سرکارا ما کی طرح سامنے ہے۔ چھوڑیئے اس کو ___ شمس نعمان سے کہئے مجھے وہ یاد ہے بلکہ اس کو یاد بھی کرتا

ہوں۔ آپ کے ساتھ میں اس کا ذکر رہا میری محبت پہنچا دیجئے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اور منصورہ احمد میرے پاس بھی آئے تھے۔ منصورہ احمد نے پھولن دیوی کی طرح سب مشاعروں کو لوٹا۔ امریکہ میں اس کی "بیجو بیجو" ہو گئی۔ تین نظمیں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے پسند کرو گے۔

تمہارا ___ افتی
(افتخار نسیم' شکاگو)

بہت ہی محترم بھائی اظہر جاوید صاحب

السلام علیکم! ذاتی سطح پر بے پایاں شفقتوں اور محبتوں کے ساتھ ساتھ۔ یہ جو آپ انتہائی باقاعدگی سے تخلیق بھجواتے ہیں تو ہر بار میرا دل آپ کے لئے دعاؤں اور نیک تمناؤں سے سرشار ہو جاتا ہے کہ مادہ پرستی کے اس دور میں آپ تخلیق کے ذریعے مسلسل شعر و ادب کی بے لوث خدمت کئے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

یہ خط میں آپ کو تازہ تخلیق میں اخلاق احمد کے افسانے "کہانی پیچھے رہ جانے والوں کی" کے حوالے سے لکھ رہا ہوں۔ اس کہانی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے گویا میں خود اس کہانی کا مرکزی کردار ہوں جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کی بجائے کسی مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔

یہ کہانی مجھ ایسے لاکھوں لوگوں کے المیے کی مظہر ہے جو Misfits کا شکار ہیں۔ بظاہر بھلے چنگے ہیں' مگر اندر ہی اندر مر رہے ہیں۔

میں اس انتہائی کامیاب افسانے کی اشاعت پر آپ اور اس کی تخلیق پر اخلاق احمد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

والسلام ___ مظفر محمد علی' لاہور

گرمی قدر والا حشم برادرم اظہر جاوید

سلام مسنون! امید ہے مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ تخلیق کی تخلیق کاری اور باغ ادب میں اس کی لالہ زاری پاک و ہند کے اہل قلم سے گلہائے تحسین و ستائش حاصل کر رہی ہے جو اس کا حق ہے۔ اللہ کریم اس بہار باغ کو صرصر خزاں سے بہر نوع محفوظ فرمائے اور اپنے خاص حفظ و امان میں رکھے (آمین)

گزشتہ چند ماہ کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بے شک ایک خاص گروہ غیر محسوس طور پر براجمان ہوتا جا رہا ہے خودنگر' خود غرض اور خود پسند لوگ جن کو خودداری سے دور کا علاقہ و واسطہ نہیں ہوتا ایسے ہتھکنڈے برتنا جانتے ہیں۔ تخلیق کا روز اول سے ہی یہ مقصد نہیں کہ وہ کسی خاص فرد یا خاص گروہ کا گرویدہ رہے۔ سادہ دلی اور نیاز مندی انسانیت کا حسن اور انمول جوہر ہیں مگر

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
جہاں میں کی ہیں بتوں نے خدائیاں کیا کیا

کے مصداق کبھی کبھی اس سے صرف نظر کرنا علم و ادب کے قصر سیمیں اور ایوان زریں میں حرانی کی حیثیت رکھتا ہے اور جب بفضلہ تعالیٰ آپ ایسے مرصع ساز ہوں تو یہ حرانی اس مرض کے لئے شافی بھی ہو گی اور کافی بھی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ احقر الناس بھی روز اول ہی سے کاروان تخلیق کے ہمراہ وہم رکاب ہے گو میرے قدم کمزور اور جذبہ بے زور ہے مگر نیت میں اخلاص اور خلوص ضرور ہے جس کی بنا پر یہ چند سطور تحریر کر رہا ہوں۔ آپ کی وجہ سے برادرم لطیف قریشی صاحب نے میرے کام کی جانب خاص توجہ فرمائی۔ انجمن خیال میں اس ضمن میں ایک مراسلہ نگار نے بھی یہ اشارہ دیا تھا تاہم میں نے بھی اپنی ذاتی رائے تحریر کر دی ہے جو کچھ محسوس کیا لکھ دیا یہ ضروری نہیں کہ میرا خیال درست ہو آگے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے' گزشتہ ایام یوم میر انیس پر ایک مقامی ہوٹل میں برادرم سلطان رشک سے ملاقات ہو گئی تھی' آپ کا ذکر خیر بھی رہا۔

برادرم لطیف قریشی (ایڈووکیٹ) گرامی قدر قتیل شفائی' عزیزی زمان کنجاہی' کنول فیروز کو سلام نیاز۔ عزیزہ امینہ عنبریں کو دعائیں۔

بآں گروہے کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

والسلام __ شاہ محمد سبطین شاہجہانی
اسلام آباد

محترم جناب اظہر جاوید

السلام علیکم! حسن' خیر اور شائستگی سے معمور' تخلیق' باقاعدگی سے مل رہا ہے' ہر شمارہ عمدہ تحریروں سے مالا مال ہوتا ہے اور خاص طور پر آپ کے لکھے ہوئے اداریئے تو کمال کے ہوئے ہیں' بندے کو دل سے پکڑ لیتے ہیں اور پورا پورا گھیراؤ کرتے ہیں' سچ بات یہ ہے کہ آپ بہت سچے کھرے اور دل والے آدمی ہیں' آپ کی ہمت اور دل بستگی قابل داد ہے۔

میں سب سے پہلے آپ کا اداریہ پڑھتا ہوں اور کوئی کوئی اداریہ تو دو دو اور تین تین مرتبہ پڑھنا پڑ جاتا ہے ___ دسمبر کے شمارے کا اداریہ بھی آپ نے حکیم صاحب کے بارے میں انتہائی دکھے دل کے ساتھ لکھا ہے۔ میں بہت متاثر ہوا ___ اللہ پاک آپ کو عزت اور صحت کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ کا مخلص __ عین سلام' کوئٹہ

اجی

تازہ تخلیق اور آپ ہی کی طرح کا دھیمی مسکراہٹ لئے "ٹیزر" ملا۔ میں بالکل آپ کو نہیں بھولا۔ اپنے آپ کو بھول رہا ہوں۔ مجھے آپ سے بات کرنے کی شدید ضرورتیں لاحق رہیں مگر رابطہ میں کمی کی بنا پر وہ سب گچھا مچھا ہو چکی ہیں۔ اس لئے چپ ہوں۔ آپ تخلیق ایسے پرچے کے خالق ہیں جس پر خود زندگی ہما کر فریفتہ ہے۔ بڑا جاندار پرچہ نکالتے ہیں۔ تم جیو ہزاروں سال (دل کا کیا حال ہے؟)

مجھے خوشی ہے کہ آپ اس پردیسی کو نہیں بھولے۔ میں سرورق پر اپنی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ آپ نے میری تصویر کا خوب بھیس بدلا۔ آخر چالاک مدیر ہیں نا!

آپ کا اپنا مقصود الٰہی شیخ، انگلستان

برادرم اظہر جاوید

آپ کے دو عدد نوازش نامے ملے اور "تخلیق" کا لالی چودھری نمبر بھی۔ لالی چودھری کا افسانہ "گڈو" "شما" ہندی میں دیا، اس بار "حد چاہئے سزا میں" دے رہا ہوں۔ لالی کو "گڈو" والے دو شما بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کر دیئے ہیں۔ رسید کا انتظار ہے۔ لالی سے کہئے کہ شمع کے لئے بھی کہانیاں بھیجیں۔ شما کے تازہ شمارے میں لالی کی کہانی کے علاوہ تخلیق کے تمام گیت دے رہا ہوں۔ آپ کی نظمیں یا غزلیں ایوان اردو میں دیکھ چکا ہوں اس سے قبل "جنگ" کراچی یا "اخبار جہاں" کے ادبی صفحہ پر آپ کی خوب صورت تصویر کے ساتھ آپ کی غزل بھی پڑھی تھی۔

"تخلیق" میں شمع کا اشتہار دیکھا۔ دہلوی برادران خوش نظر آئے۔ آئندہ کے لئے آپ کو نیا اشتہار بھیجا جائے گا۔ یونس صاحب نیا اشتہار بھجوائیں گے۔ میں نے سلام مچھلی شہری پر کتابیں کیا بھجوائیں اس بار کالم ہی نظر نہیں آیا۔ دھرمیندر کے بھائی سے مارچ 1998ء میں ملاقات ہوئی تھی اب اگر بمبئی گیا تو اپنے سامنے ان سے شکریہ کا خط لکھواؤں گا۔ اگر فروری تک لاہور تا دہلی بس سروس شروع ہوجائے تو اس سفر کا لطف لیجئے۔ خرچہ بھی کم ہو گا اور ایک نیا تجربہ بھی۔ لہٰذا اس بہانے دہلی کے دوستوں سے ملاقاتیں بھی ہو جائیں گی۔

یونس صاحب کے پاس آپ کی غزل محفوظ ہے آئندہ کسی شمارے میں شائع ہو گی۔ آج ہی میں نے اس ضمن میں ان سے بات کی۔ کل رات مخمور دانتوں کے سلسلے میں آئے تھے، آپ کی شکایت ان تک پہنچا دی۔ کیول ہمیشہ کی طرح خوش اور ناراض نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک شام امیر کے گھر منائی۔ ہم تینوں نے، کیول کا ہم سب بہت خیال رکھتے ہیں۔

اگر اجازت دیں تو لالی کو خط لکھوں، آپ چاہیں تو انہیں میرے گھر کا نمبر 3518604 دے دیں۔ وہ کیول کو فون کرتی ہیں شاید کسی دن مجھے بھی یہ اعزاز بخش دیں۔

ساقی صاحب سے پچھلے دنوں اردو اکادمی میں ساقی فاروقی کے فنکشن میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح مسکراتے نظر آئے۔ غالب کی دو صدی تقریبات سرکاری طور پر خوب دھوم دھام کے ساتھ منائی گئیں۔ اس موقع پر ثریا، گلزار، جگجیت سنگھ کو ایوارڈ دیئے گئے۔ نصیرالدین شاہ تقریب میں نہ آسکے۔

اس بار اگر فروری میں آپ آئے تو پھر میری نوشاد کی سوانح حیات کو پاکستان میں چھپوانے کا اہتمام کیجئے۔ شاید اس بہانے پاکستان آنا ممکن ہو سکے۔

اخبار جہاں میں راوی کنارے کالم لکھنے والے اظہر جاوید کیا آپ ہیں؟ ملتان والے دوست مشتاق شیدا اپنی افسانہ نگار بیٹی صباحت مشتاق کے ساتھ لندن گئے ہوئے ہیں۔ وہاں سے امریکہ جائیں گے۔ تازہ شمع میں صباحت کی کہانی "نیلو فر" ضرور پڑھئے گا۔ ریاض الرحمان ساغر سے کیا آپ کی علیک سلیک ہے اگر ہاں تو اس اللہ کے بندے سے کہئے کہ

دہلی میں ظہیر ناصر ابھی زندہ ہے۔

اس بار آپ کا قیام اپنے دوست کے فلیٹ پر کراؤں گا۔ شمع کے دفتر سے چار منٹ کا راستہ ہے دہلی اور نئی دہلی کے سنگم پر۔ وہیں سب دوستوں کی محفلیں جمیں گی پچھلے دنوں کیول کو بھی ان سے ملوایا اور کیرن ان کی میزبانی سے خوش ہوئے۔ آپ بھی تو رمضانی پہلوان سے مل چکے ہیں انہی کے فلیٹ پر۔ میرے ایک عزیز کل کراچی جا رہے ہیں ان کے ہاتھ یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔ دعاؤں کا طالب۔

خیراندیش : ظہیر ناصر' ماہنامہ "شمع" دہلی

برادر گرامی! اظہر جاوید

یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ اپنی محبتوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ اپنی چند ایک کتب ارسال خدمت ہیں' قبول فرمایئے۔ میں نے فیض مرحوم کی زندگی میں ان کی پیروی میں ایک نظم کہی تھی اس کا مطلع ہے :

تمہارے شہر کی بنیاد جب اٹھائی گئی
تو پہلے میرے گھرانے کی چھت گرائی گئی

اب بشیر سیفی نے مطلع کہا ہے :

نیا شہر جب بھی بسایا گیا ہے
کئی جھونپڑوں کو گرایا گیا ہے

آپ صاحب نظر ہیں اس لئے آپ سے مخاطب ہوں۔

آپ خود ہی ملاحظہ فرمایئے لوگ کہاں کہاں سے Cooked Food حاصل کرتے ہیں۔ اور مزے اڑاتے ہیں۔

گزشتہ دنوں اسلام آباد میں اہل قلم سے تالیاں بجوائیں گئیں۔ میں بھی کانفرنس میں حاضر تھا۔ (وزیراعظم ہاؤس میں نہیں) آپ کو آنکھیں تلاش کرتی رہیں' آپ کہاں تھے۔ میرا ایک بیٹا فوج میں ہے۔ آج کل لاہور بارڈر پر ہے' میں بروز ہفتہ لاہور پہنچ جاؤں گا۔ خدا کو منظور ہوا اور موقع ملا تو آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

آپ کا رشید نثار

ڈیئر اظہر جاوید

1998ء کا سال میرے لئے ایسی دائمی جدائی لے کر آیا جس کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوں گے اور ڈھیر ساری خوشیاں اور کامرانیاں بھی عطا کر گیا۔ آپ نے تخلیق میں اور محترم کیول سوری صاحب نے ایوان اردو دلی میں میری کہانیاں شائع کر کے مجھے بہت بڑے اعزاز سے نوازا۔ وائس آف امریکہ نے میری کہانیوں کے سلسلے میں لاس اینجلس سے میرا Live انٹرویو براڈ کاسٹ کیا۔ میرے شہر کے اخبار میں Steve رابرٹ (میرے باس) نے میرے بارے میں فیچر آرٹیکل شائع کیا۔ اور ان سب سے میگا ٹائم خوش کن بات یہ کہ شکاگو سے افتی نسیم اور سانتامونیکا سے سیر آپا کے فون

آئے کہ آپ نے میرا بہت خوبصورت تعارف کرایا ہے اور ڈاکٹر سدید صاحب اور ڈاکٹر عالم خاں صاحب نے میری کہانیوں پہ جامع تبصرے لکھے ہیں۔

نیر آپا کی خوشی قابل شنید تھی (اس دن تک مجھے تخلیق نہیں ملا تھا) اپنی دوست پروین امداد احمد سے میں نے یہ آرٹیکل سنے اور بعدازیں خود بھی پڑھے۔ یوں تو بہت سی حقیقتوں کو جاننے کے باوجود میں انہیں تسلیم نہیں کرتی لیکن ڈاکٹر سدید صاحب اور ڈاکٹر عالم خاں صاحب نے جس کمال مہربانی سے دلکش پیرائے سے میری کہانیوں کو سراہا اور آپ نے جس خلوص اور شفقت سے اپنے دلنشین انداز میں کہانیاں لکھنے والی کی تصویر کشی کی اور کیول سوری صاحب نے جس بے لوث محبت سے ہندوستان کے ادبی حلقوں میں روشناس کرایا اور کہانیوں کا ہندی ترجمہ کیا تو کچھ دیر کے لئے مجھے اس افسانوی حقیقت کو تسلیم کرنا بھی پڑا کہ میں واقعی افسانہ نگار ہوں کیونکہ یہ تشخیص ان چار ممتاز اور نامور ہستیوں کی ہے جو اردو ادب کے بہت معتبر اور مستند نبض شناس ہیں لیکن میں یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ مجھے یہ مرض وراثتاً" نہیں ملا ہے بلکہ آپ سب کی کرم فرمائیوں سے عنایتاً" ملا ہے کہ ہمارے ہاں تو نسل در نسل کسی میں لکھنے لکھانے کے جراثیم نہیں۔ اپریل 97ء میں جب میری بہنوں کو پتا چلا کہ شیزان کی تقریب ادبی سلسلے میں ہو رہی تھی تو میری دیدی نے خفگی سے کہا "کیا تکلیف تھی تمہیں جو لکھنا شروع کیا"

میں نے اپنا وہی جواز پیش کیا کہ کسی نے ساحر لدھیانوی کا تیا پانچا کیا تھا ان کی مدافعت کرتے کرتے کہانیاں لکھنے لگی۔

میری آپی جو بہت ڈھیلے مزاج کی ہیں بڑی دھیرج سے مجھے سمجھانے لگیں کہ "جو ہو گیا سو ہو گیا آئندہ کبھی کچھ مت لکھنا اور اس علت سے دور ہی رہنا"

لیکن آپ نے جس خوبصورت انداز میں میرے خمیر میں دیہات کے حسن اور میرے ضمیر میں لاہور کے بانکپن کا ذکر کیا ہے تو مجھے یہ "علت" بہت سپر ڈپر لگنے لگی ہے۔

دیہات کے بارے میں ایک کہاوت کا ذکر میں پہلے بھی کسی خط میں کر چکی ہوں جس کا لب لباب یہ ہے کہ پینڈو ہمیشہ پینڈو ہی رہتے ہیں اور مجھے اپنے پینڈو ہونے پہ بہت ناز ہے۔ میں تو یہ خط بکی امرود کے درخت تلے رنگیں پایوں والے تخت پوش پہ بیٹھی لکھ رہی ہوں (آج درجہ حرارت 80 ہے)۔

لاہور کے بانکپن کے بارے میں مجھے ارنسٹ ہیمنگوے کے یہ فقرے یاد آرہے ہیں جو اس نے اپنے دوست کو لکھے تھے "اگر تم خوش قسمت ہو تو ایام جوانی میں تمہیں پیرس رہنے کا موقع ملا ہو گا۔ اس کے بعد تم جہاں جہاں بھی جاؤ گے پیرس میں گزارے ہوئے دنوں کی یادیں تمہارے ساتھ ساتھ رہیں گی" ہیمنگوے کے یہ الفاظ لاہور پہ بھی صادق آتے ہیں کہ لاہور ہڈیوں میں رچ بس جاتا ہے۔ رگوں میں ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔

اصل میں یہ ساری Yaf Yaf اس لئے ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ سب کی بے پناہ محبتوں اور نوازشوں کا ذکر کن الفاظ میں کروں اور اظہار تشکر میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ ابھی تو خوشی سے سرشار ہوں۔ ہوا کہ دوش پہ پرواز کر رہی ہوں۔ ہوش و حواس ذرا ٹھکانے پہ آئیں۔ دھرتی پہ ذرا قدم لگیں تو شاید کچھ سلیقے اور قرینے

سے یہ بات کہہ سکوں کہ آپ کی شفقتوں اور عنایتوں کی اس قدر مقروض ہوں کہ عمر بھر سود بھی ادا نہیں کر پاؤں گی۔ اور لاکھ شکریہ ادا کروں بھی تو "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہے گی۔ بہرکیف آپ کا کیول سوری صاحب کا' ڈاکٹر سدید صاحب اور ڈاکٹر عالم خان صاحب کا تہہ دل سے شکریہ۔ عمیق قلب سے شکریہ' صد ہزار بار شکریہ۔

میں ایسے دوست احباب اور قارئین کی بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے میری کہانیوں کو پسند فرمایا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے فیض الرحمن صدیقی صاحب (ایڈیٹر ان چیف پاکستان لنک) کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ہے جنہیں پہلے تو یہ حیرت ہوئی کہ میں پاکستانی ہوں اور مجھے اردو آتی ہے اور پھر مجھے اتنا Persue کیا کہ کچھ نہ کچھ لکھوا کے چھوڑا۔ میں انہیں یقین دلاتی کہ میں رائٹر نہیں ہوں۔ وہ مجھے قائل کرتے کہ "لالی" تم میں خداداد صلاحیت ہے سو مجھے رائٹر بنانے میں ان کا بہت عمل دخل ہے۔

اور اب ڈاکٹر سدید صاحب کی اس بات کے جواب میں کہ آپ نے پوری طرح سے میرا تعارف نہیں کروایا تھا بڑی معذرت کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کر رہی ہوں کہ آپ نے تعارف تو ٹھیک ٹھاک کروایا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے شاید سنا نہیں کیونکہ وہ خواتین و حضرات کی ایک ایسی ٹولی میں بیٹھے تھے جس میں ایک Newly wed صاحب بھی موجود تھے جن سے اس کی شب عروسی کی Juisy details پوچھی جا رہی تھی Ooops کہیں یہ بھی ہش ہش قسم کی بات تو نہیں تھی۔ کہانی کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ یوریکا کے سپلنگ میں گڑ بڑ ہو گئی ہے اور آخر میں اس فلسفے پر نوشے فار دس کلیشے کا ترجمہ تھا جو Some How جواری کے ڈائس کی طرح پھینکنے کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔ کل نیر آپا اور مہا بچوں کو لے کر امرود اور انار توڑنے آئی تھیں۔ پچھلے سال مہا بچوں کے ساتھ آئی تو آپ یہاں تھے۔ ہم سب نے باجماعت آپ کو بہت یاد کیا۔ اب اجازت۔ آپ کو' سب قارئین اور دوست احباب کو نیا سال مبارک ہو۔ بہترین دعاؤں اور بہت بہت شکریہ کے ساتھ خدا حافظ۔

لالی چودھری

برادرم اظہر جاوید صاحب

ادبی جھڑپ پارٹ آف دی گیم ہے۔ بعض جھڑپیں پانچ سات جملوں کے تبادلے کے بعد ختم ہوتی ہیں۔ بعض مہینوں چلتی ہیں۔ حریفوں میں زور آزمائی ہوتی رہتی ہے' دنگل کے رسیا' مزے لوٹتے ہیں۔ پچھلی پون صدی میں بعض معرکہ آرائیاں قارئین کی علمی اور ادبی تربیت کا ذریعہ بنیں' بعض سے علمی و ادبی فائدہ Fringe benifit سے آگے نہ بڑھا کیونکہ ان کا دائرہ زیادہ تر ذاتیات تک رہا۔ بسا اوقات زبردست ہنگامہ خیزی کے بعد اس آن تمام ہوئے جب بات چیت پروقار نہ رہی' ان میں سوقیانہ رنگ آگیا' پہلوان ادبی اکھاڑے سے نکل کر بند گلی میں آگئے۔ آگے جانے کا انہیں راستہ نہ ملا۔

امتیاز علی تاج کا بے مثل ڈراما ___ انارکلی چھپتے ہی بحث شروع ہو گئی' ڈراما کہاں تک تاریخ کو تہس نہس کر سکتا ہے؟ ڈرامائی ضرورت کا حدود اربعہ میں تاریخ کو مسخ کرنے کی گنجائش ہے کہ نہیں؟ کسی کی کردار کشی کے لئے

تاریخی حقائق کو نظر انداز کرنا چاہئے کہ نہیں؟ کیا ڈراما نگار اخلاقیات سے بے نیاز ہوتا ہے؟

یہ بحث بڑی علمی و فنی افادیت رکھتی تھی۔ شاہد احمد دہلوی "مخاص" کے روپ میں مقابل آئے۔ ماہنامہ "ساقی" کے لکھاریوں نے زبردست قلمی محاذ قائم کیا۔ جواباً" حکیم یوسف حسن کے "نیرنگ خیال" میں "نیاز مندان لاہور" کا گروپ لنگر لنگوٹا کس کے اکھاڑے میں کود پڑا۔ دونوں دھڑوں میں ادباء اور سکالر شامل تھے۔ مہینوں جنگ جاری رہی۔ 1932ء میری قلمی زندگی کے آغاز کا سال تھا۔ میں باقاعدگی سے "ساقی" اور نیرنگ خیال" کا مطالعہ کرتا رہا' علم و ادب کی تربیت پاتا رہا۔ پرچے محفوظ کرتا رہا لیکن اندور' بھوپال بمبئی اور دلی کے سفر میں پرچوں سمیت میں خود ادھر ادھر ہو گیا۔

معلوم نہیں' ہمارے یہاں کسی لائبریری میں "ساقی" اور "نیرنگ خیال" کے یہ نادر پرچے موجود ہیں کہ نہیں۔ مجھے وہ لوگ بھولے نہیں جو اعراب' اور میں سے 'کو' تک کی غلطیاں پکڑنے والے چپ نہیں رہتے تھے۔ غلط نویسی شرمناک لغزش تھی۔ اس سے قلمکار کے نام کو بٹہ لگ جاتا۔

میں نے کیا لینا' کیا دینا
مجھے کیا لینا' کیا دینا

میں جو فرق ہے' آج کا نیا قلمکار بے خبر ہے۔ روکے ٹوکے کون؟ روکنے ٹوکنے والے سے کہا جاتا ہے' لے جائے اپنی زبان دانی اپنے گھر' ادیب اور شاعر کی جذباتی تخلیقی لہر بہت کچھ بہا کے لے جاتی ہے۔ جذبہ سلامت رہے' خیال قاری یا سامع کی سمجھ میں آجائے تو کافی ہے۔ زبان اور الفاظ کی اچھاڑ پچھاڑ کا غم نہ کرو! باقی سب خیریت ہے۔

پچھلی پون صدی میں جھڑپیں بھی ہوئیں' دنگل بھی ہوئے' سلسلہ جاری ہے' لہو گرم رکھنے کا ہے یہ بہانہ۔ علمی اور ادبی بحثیں قارئین کو فائدہ پہنچائیں۔ شعور کے دریچے وا کریں تو سبحان اللہ ورنہ ذاتی لڑائیوں سے وقت کا زیاں ہوتا ہے اور بس۔ کام کی بات کوئی نہیں ہوتی۔

ذاتیات کو بیچ میں لے آئیں تو خیال آخریں کے کواڑ بند ہو جاتے ہیں۔

حال ہی میں آپ کے موقر جریدے "تخلیق" میں لفظی غلط فہمی کی بنا پر محترمی ڈاکٹر انور سدید اور محترمی کیول سوری کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ قارئین کو یہ واقعہ ناگوار گزرا۔ ادھر کے قارئین نے کیول سوری کے حق میں بڑی کشادہ دلی سے اظہار خیال کیا۔ میں کیول سوری اور بھارت کے ان تمام ادیبوں اور شاعروں کا صدق دل سے احترام کرتا ہوں جو اردو کش ماحول میں رہتے ہوئے بھی اردو کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ ہمارے یہاں ان کی تخلیقات چھپتی اور قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ کیول سوری صاحب کا دل دکھا' سو برا ہوا لیکن' انور سدید صاحب نے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ پھر جب "تخلیقی پاکستان" کا مفہوم واضح کیا گیا تو انور سدید نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر بڑی کشادہ دلی سے "تخلیق" کے دسمبر 98ء کے شمارے میں لکھا:

"میں کیول سوری صاحب سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں کہ میں اپنی کم عقلی کی وجہ سے ان کی ترکیب تخلیقی پاکستان کے صحیح معنی تک نہ پہنچ سکا اور اس پر اظہار خیال کرتے وقت خدا جانے

کیا کہہ گیا۔ کیول سوری صاحب اپنے ایک ادنیٰ نیاز مند کو معاف کر دیجئے"

انور سدید کی یہ بڑائی ہے کہ انہوں نے برملا اپنے سہو کا اعتراف کیا اور معذرت کا اظہار کیا۔ امید ہے کیول سوری صاحب کا دل صاف ہو گیا ہو گا اور یہ معاملہ رفع دفع سمجھا جائے گا۔ مٹی ڈالئے اس پر۔

اس سلسلے میں ناصر شہزاد کا خط (شمارہ مذکور) میں چھپا۔ خصوصیت سے لائق توجہ ہے۔ ناصر شہزاد بڑے سلجھے ہوئے قلمکار ہیں۔ انہوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کی بجائے صلح جوئیانہ انداز اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شری کیول سوری کا خط پڑھ کر میرا جی اندر سے پاش پاش ہو گیا۔ بٹوارے سے کچھ ایسی چیزیں بھی ہمیں تیاگنی پڑیں جنہیں ہم تیاگنا نہیں چاہتے تھے' اب ہمارے من مہجور محبتوں کے مسکن ہیں جن میں عجیب و غریب یادیں دمکتی ہیں اور چمکتی رہتی ہیں۔ کیول سوری جی تو لائق تحسین و آفرین ہیں کہ وہ ایک ایسی زبان میں شعر کہہ رہے ہیں جس کا مستقبل اب ان کے دیس میں زیادہ منور نہیں۔ کیول سوری جی' انور سدید تو بڑے کشادہ دل اور بڑے کشادہ ذہن کے ادیب ہیں۔ جس فقرے نے آپ کا دل دکھایا وہ ان کے مضمون کے کسی پیرایہ کا سرمایہ ہو گا۔ آپ کے لئے کیوں پرایا تھا"

سچ تو یہ ہے' ایک طرف ڈاکٹر انور سدید نے کہا سوری جی I am sorry دوسری طرف ناصر شہزاد نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا اور بات بڑھنے سے روکا۔ ان کی یہ تدبیر مثبت انداز کی ہے۔

اسی شمارے میں جمیل یوسف بھی چمکے ہیں انور سدید صاحب' موصوف کے پرانے ہم کار اور واقف کار ہیں۔ ان کی باسی کڑھی میں کبھی کبھی ابال آجاتا ہے اور پھر وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ وہ انور سدید سے الرجک ہیں اور جب کوئی بندہ کسی سے الرجک ہو تو پھر وہ اس کی اچھی باتوں سے بھی چڑتا اور بھڑک اٹھتا ہے۔

جمیل یوسف کی بیماری ناقابل علاج ہے کیونکہ یہ تیسرے درجے تک پہنچ چکی ہے وہ انور سدید پر نکتہ چینی کرنے ہی میں اپنی نجات سمجھتے ہیں انور سدید کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں۔ ان کی قلمی فتوحات ڈھکی چھپی نہیں۔

"جمیل یوسف کا اسلوب بیان کسی طور پسندیدہ نہیں۔ لکھتے ہیں:

"جناب کیول سوری کے پرخلوص اور نیک جذبات کو جس طرح انور سدید صاحب نے ٹھیس پہنچائی ہے' کیول سوری کے خط میں اس کی تفصیل پڑھ کر میں دکھی ہو گیا ہوں۔ اے انور سدید! تیری ناسمجھی اور بے شعوری بلکہ کج فہمی کا کیا علاج کروں؟ تم نے کس دریدہ دہنی سے لکھا ہے کہ " مجھے اس کا حق پہنچتا ہے"

یہ لب و لہجہ کسی طور قابل ستائش نہیں۔ کیول سوری کے پرخلوص اور نیک جذبات بہرطور قابل ستائش ہیں۔ انور سدید کے لئے بھی قابل ستائش ہیں۔ بھارتی ادیبوں کی بوجوہ اس ملک میں بڑی توقیر ہے۔ جو کچھ ہوا' غلط فہمی پر ہوا۔ اس پر انور سدید کو افسوس ہے اور وہ اس کا اظہار کر چکے ہیں۔

انور سدید ایک بلند قامت ادیب اور نقاد ہیں جس منکسرانہ لہجے میں انہوں نے معذرت کی ہے اس سے مزید

باند قامت ہو گئے ہیں۔

جمیل یوسف نے بھارتی اور پاکستانی ادیبوں کو آپس میں لڑانے اور ان میں دراڑیں ڈالنے کی جو کوشش کی ہے وہ بہت مذموم ہے۔

ان کا خط ذاتیات سے ماوراء کچھ نہیں۔ کسی خالص ادبی مسئلے پر علمی بحث کرتے وقت ذاتیات کی لعنت سے بچ کر ہی بات بنے گی۔ ذاتیات کو بیچ میں لا کر ہانڈی میں مصالحے کی جگہ مٹی اور کنکر ڈالنے سے خرابی پیدا ہو گی جو نام نہاد نقاد یا ادیب جانچ پرکھ کے کھرے اصول نظر انداز کر کے جلی کٹی سناتے اور دل کی بھڑاس نکالتے ہیں وہ آخر منہ کی کھاتے ہیں۔

جمیل یوسف کا یہ ریمارک نادرست ہے:

"انور سدید "سمجھے بغیر اور جو نکتہ اٹھایا گیا ہو اس پر غور کئے بغیر جو نوک قلم پر آئے لکھ دیتے ہیں۔ قلم سے وہ تلوار کا نہیں' قصاب کے چھرے کا کام لیتے ہیں۔ ان میں کوئی بات سمجھنے کی اہلیت نہیں۔ بات کوئی اور ہوتی ہے' جواب کوئی اور دے مارتے ہیں۔ سوال گندم جواب چنا۔ جیسے کہ فارسی کی کہاوت ہے' من چہ می سرائم و طنبورہ من چہ می سراید"

ایسی تحریریں ہمیشہ کسی بڑے فن کار کی ٹانگ کھینچ کر اپنا امیج بنانے کے لئے ہوتی ہیں۔ انور سدید اور جمیل یوسف میں درجے اور مقام کا جو فرق ہے قارئین کرام اس سے بے خبر تو نہیں۔

جمیل یوسف صاحب نے جو فارسی کی کہاوت بیان کی ہے وہ ذرا اس کے مفہوم و مطلب پر ٹھیک سے غور کریں۔ یہاں یہ مثال بے جا ہے۔

رحمان مذنب

بھائی اظہر جاوید

السلام علیکم! "تخلیق" کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے' "اپنی بات" پر نگاہیں جمی ہوئی ہیں اور سوچ رہا ہوں کہ وہ حسین خواب جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ پہلے دیکھا تھا اس کی تعبیر کیا اتنی روح فرسا ہو سکتی ہے؟ حکیم سعید کا قتل واقعی ایسا المناک سانحہ ہے جو مجھے بھی ذاتی طور پر جانے کب تک خون کے آنسو رلاتا رہے گا۔ آپ نے لاکھوں کروڑوں دلوں کی ترجمانی کرتے ہوئے حرف بہ حرف درست لکھا ہے "یہ ایک انسان کا نہیں انسانیت کا قتل ہوا ہے" قریب قریب 45 برس پہلے میں نے اس مسیحا نفس' کو دیکھا اور سنا پھر اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ بڑی شفقتوں سے درس و تدریس اور علم و ادب کے شعبوں میں میری خدمات کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ صرف زبانی کلامی اور تحریری طور پر نہیں بلکہ دامے' درمے بھی۔ موصوف کے حسن سلوک اور انسانیت نوازی کے کن کن لمحوں کی یادوں کو دہراؤں۔ وہ ماہنامہ "تخلیق" کو اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود خدا جانے کب پڑھ لیتے تھے کہ ہمدرد مجلس شوریٰ کی ایک ماہانہ میٹنگ میں بطور خاص مجھ سے دریافت کیا "تخلیق" میں آپ کی نظم (شہر آذر بتا) شائع ہوئی اس کا پس منظر کیا ہے" میں نے مودبانہ طور پر عرض کیا "قبلہ حکیم صاحب وہ نظم دراصل اپنے کرمفرما مصطفیٰ زیدی' کی یاد میں

لکھی تھی"۔

یقین جانئے مجھے بڑی حیرت ہوئی جب یہ بات میرے علم میں آئی کہ وہ تازہ بتازہ کتابوں اور جریدوں کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے فرماتے تھے اور سفر میں بھی یہ مطالعہ جاری رہتا تھا۔

آپ نے "اپنی بات" میں دکھوں کو آپس میں بانٹ لینے کی بات کی ہے تو اپنا ایک اور دکھ بیان کرتا چلوں اور وہ یہ کہ نومبر کے وسط میں ایک شب میرے گھر کا صفایا ہو گیا۔ پاس پڑوس کے ہونہار نونہال سب کچھ اڑا لے گئے۔ ٹی وی' وی سی آر' زیورات' نقدی اور وہ مالیاتی دستاویزات بھی جو ان کے کام نہ آئیں گی۔ ہاں میری ہوش ربا پریشانیوں کو کہیں زیادہ بڑھا گئی ہیں۔ بھائی میرے! یہ شہر قائد تو جرائم کی لپیٹ میں کچھ اس طرح آیا ہوا ہے کہ پولیس کا فرض شناس عملہ بھی مجرموں کی پشت پناہی اور سرپرستی میں پیش پیش ہے۔

رنج یہ ہے سرخرو ہے رہزنی
اپنے لٹ جانے کا اتنا غم نہیں

حکیم سعید میرا آئیڈیل تھے ان کی جدائی بہت تڑپاتی ہے۔ کارساز حقیقی آپ کو سلامت باکرامت رکھے۔

آپ کا اپنا! ___ آفاق صدیقی

مکرمی و محترمی اظہر جاوید

السلام علیکم! امید ہے آپ بہ خیر ہوں گے۔ شکرگزار ہوں کہ آپ نے تخلیق عنایت فرمایا۔ اس کے لئے بھی ازحد شکر گزار ہوں کہ اس ہیچ مدان کا مضمون شامل اشاعت کیا۔ اسی حوصلہ افزائی کے سبب ایک کتاب پر تبصرہ نما مضمون مزید ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے شامل اشاعت فرمائیں گے۔

آپ نے "لالی چودھری" پر گوشہ شائع کر کے بہت اچھا کیا۔ برصغیر پاک و ہند سے دور بیٹھے ان ادباء کا ذکر ہوتا رہنا چاہئے جو اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس پذیرائی سے ایک تو ان ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہتی ہے دوسرے ہم جیسے کم علم قاری حضرات بھی تخلیق نگاروں سے واقفیت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

جمیل یوسف صاحب نے ڈاکٹر انور سدید کو جو گالم گلوچ کی ہے' اسے پڑھ کر دکھ ہوا۔ جمیل یوسف صاحب نے اس کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں' انہیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ڈاکٹر انور سدید سے ذاتی رنجش ہے۔ یہ بہت بری بات ہے کہ ذاتی رنجشوں کی وجہ سے ادب کے میدان کو میدان کارزار بنا دیا جائے۔ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی مختصر تاریخ ادب اردو میں جن ادیبوں کا تذکرہ تفصیل سے نہیں کیا' وہ ان کے خلاف بلاوجہ زہر اگلنے لگے۔ جمیل یوسف صاحب کا بھی معاملہ کچھ اسی قسم کا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے ڈاکٹر انور سدید کو گالیاں دینے پر مجھے مرزا غالب کا لطیفہ یاد آگیا۔ جس طرح مرزا غالب کو آخر عمر میں گالیاں دینے پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا' اسی طرح غالباً" ڈاکٹر انور سدید کو بھی اس طرز عمل سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے۔ ہاں! فرق پڑنا چاہئے اور پڑتا ہے تو گالی دینے والے کو۔ مقصدی تنقید سر آنکھوں پر لیکن انتقامی جذبے کے تحت کی گئی دشنام طرازی کو کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

میں آج کل "انیسویں صدی میں اردو گلدستے ___ تاریخ و تحقیق" کے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہوں۔ کچھ مواد میں نے حاصل کر لیا ہے۔ آپ کے موقر جریدے کے توسط سے میں قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ کسی صاحب کے پاس پرانے گلدستے ہوں تو عکس نقل مرحمت فرما کر میری مدد فرمائیں۔

والسلام ___ رفاقت علی شاہد

پیارے بھائی اظہر جاوید،

خدا کرے تم مزے میں ہو۔ لاہور، جہاں تم ہو اور جس کی خوشبو خاک سے میرا خمیر تیار ہوا، کے لئے چار غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ میں مشکور رہوں گا اگر انہیں یکے بعد دیگرے یعنی دو دو کر کے تخلیق میں شامل کر لو اس سے ذرا تسلسل و بنا رہے گا۔

دعائیں۔ طور

(کرشن کمار طور، شملہ)

پیارے اظہر، نیا سال مبارک!

دسمبر کا تخلیق ملا۔ شکریہ!

حکیم سعید کے قتل پر بھارت میں بھی بہت سے اداریے لکھے گئے۔ خبرنامے شائع ہوئے لیکن اپنی بات پڑھ کر محسوس ہوا کہ یہ محض ایک اداریہ نہیں ہے، بڑے گہرے دکھ اور کرب کا اظہار ہے۔ انسانیت کے قتل پر ایک ایسا بین ہے جسے سن کر پتھر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود یہ خیال بھی آیا کہ یہ صحرا میں اذان ہے۔ اس خیال کی کوکھ سے بڑی اذیت ناک بے بسی اور بے چارگی جنم لیتی ہے۔

اس شمارے میں گیت پیش پیش رہے۔ قتیل شفائی، احمد ظفر اور ندا فاضلی کے گیت ذہن میں دیر تک چھن چھناتے رہے۔ مائی ڈیر ناصر شہزاد کے گیت کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ وجہ--؟ یہ ڈر کہ لوگ کہیں گے کہ ناصر شہزاد اور کیول سوری ایک دوسرے کو حاجی کہہ کر اس تصور میں مگن رہتے ہیں کہ حج کی ساری برکتیں ان دونوں کے لئے وقف ہو گئی ہیں۔ البتہ اگر کسی اور نے ان کے گیت کی تعریف کی تو اس آواز میں میری آواز بھی شامل ہوگی۔ عمور سعیدی کی نظم پیش وپس، کا پیش ذہن کے کینوس پر بڑی خوش رنگ تصویریں اجاگر کرتا ہے۔ پرویز بزمی کے ماہیے اپنی جنم بھومی کی طرح البیلے ہیں۔ البتہ ترا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ جان چلی جائے کیا عہد نہ ٹوٹے گا۔ میں لفظ کیا، اکھرتا ہے۔ یا تو وہ، تو کیا، کہتے (جس میں عروضی مجبوریاں حائل تھیں) یا پھر، پر، سے کام چل سکتا تھا۔ غزلوں کا حصہ بھی بڑا جان دار ہے۔ جمیل ملک، نسیم سیفی، کرشن ادیب، پنہاں اور پروین کمار اشک خاص طور پر متاثر کرتے ہیں۔ اخلاق احمد کی (کہانی پیچھے رہ جانے والوں کی) دلچسپ ہے۔ کاش وہ آخر میں اسے اتنا میلو ڈرامائی نہ کرتے۔ نازلی کے اس بیان پر "میں تمہارے لئے ایک اور رات کی دعا کروں گی" کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔

لالی چودھری کے بارے میں آپ کی اطلاع صحیح ہے۔ ان کی دو کہانیوں کے ہندی ترجمے میری نظر سے بھی گزرے ہیں۔ تخلیق کے دسمبر کے شمارے میں ان کا نیا افسانہ ایک لفظ کہ کشتی، پڑھا۔ ان کے افسانے گڈو کے

بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کسی صاحب نے انجمن خیال' میں بہت اچھی اور خیال افروز بات کہی تھی کہ اپنی پہلی کہانی ہی سے لالی چودھری نے جو روایت قائم کی ہے وہ ان کے لئے وقت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ (کاش میں ان کا نام اور صحیح جملہ Quote کر سکتا۔ یہ تو محض یادداشت کے سہارے لکھا ہے) جب بھی ان کی نئی کہانی سامنے آتی ہے یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس روایت کا کیا ہوگا؟ میرے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ ابھی تک انہوں نے خود ساختہ روایت کا احترام پیش نظر رکھا ہے۔ زیر نظر کہانی میں انہوں نے مرد کی ذہنیت اور رویے کو بڑے موثر ڈھنگ سے Expose کیا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کے گھر کے سامنے گٹار کی دھن پر ایسے گیت سنائے گا کہ چودھویں رات کی چاندنی اور بھی اجلی ہو جائے گی۔ وہ اس سے یہ بھی کہے گا کہ "جاناں میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں' میری تکمیل کر دو میری مُی"۔ وہ اسے یہ بھی یقین دلائے گا کہ اس کا چہرہ عمر خیام کی رباعیوں جیسا دلربا ہے اور اس کے ہونٹ مومن کے شعروں جیسے خوبصورت۔ لیکن ہونٹوں اور چہرے کو دیکھنے کے بعد وہ یہ دیکھنا کبھی نہیں بھولے گا کہ اس کے کندھوں پر ٹکی ہوئی گردن جھکی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر اسے اس میں وقار یا Self Respect کی کوئی جھلک نظر آ گئی تو چھٹکی ہوئی چاندنی کا پیکر یک بیک شجر ممنوعہ ہو جائے گا۔ وہ بیوہ کو اپنا سکتا ہے کہ بیوگی بے چارگی کی علامت ہے' لیکن مطلقہ کو نہیں کہ اس میں اسے سرکشی کا گمان ہوتا ہے۔ میں لالی چودھری اور اظہر جاوید دونوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ایک اچھی کہانی پڑھنے کو ملی۔

انجمن خیال میں ڈاکٹر انور سدید کا خط پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ میری تحریر سے انہیں جو غلط فہمی ہوئی تھی' اس کا ازالہ ہو گیا۔ لیکن دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں اور اپنے ایک ادنیٰ نیاز مند کو معاف کر دیجیے۔ لکھ کر انہوں نے اپنی وسعت قلبی فراخدلی اور بلند قامتی کا ثبوت تو دے دیا لیکن میرے جذبہ پرستش کو ٹھیس پہنچائی۔ انجمن خیال کے توسط سے تو یہ ممکن نہیں' البتہ اگر کبھی ان سے نیاز حاصل کر سکا تو شاید انہیں یقین دلا سکوں کہ میں ان کے ادنیٰ مداحوں میں سے ایک ہوں۔ بہرحال میں ناصر شہزاد (وہ چاہے مجھے شری کیول سوری' یا کیول سوری جی' کہہ کر اجنبیت کا اظہار کریں' میں انہیں مائی ڈیر ناصر شہزاد ہی کہوں گا) جمیل یوسف اور ابدال بیلا کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے درد کو محسوس کیا۔ معاف کیجیے گا میرے نزدیک درد کا رشتہ یہی ہے۔ وہ نعرے بازی نہیں جو وہاں کے احمد فراز اور یہاں کے سردار جعفری جیسے پیشہ ور شاعر مشاعرے لوٹنے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے دلی میں کسی کیول سوری کا دل سلگتا ہے تو ساہیوال میں کسی ناصر شہزاد' مری میں کسی جمیل یوسف اور کوئٹہ میں کسی ابدال بیلا کو اس کی آنچ سے تقویت ملتی ہے۔ آپ کو کہاں کہاں یاد کریں گے فیض صاحب:۔

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
ہمارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

اللہ بیلی
کیول سوری۔ نئی دلی

"عابد علی عابد نمبر" ۔ "کہانی نمبر" اور "سندھی ادب و ثقافت نمبر"

کے بعد

"تخلیق" کی ایک اور دستاویزی پیشکش

خلیجی ریاستوں میں اُردو

یہ خاص نمبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہونا تھا، مگر چند مہربانوں کے عدم تعاون اور کچھ ناگزیر اور نامساعد حالات کے سبب معاملہ کھٹائی میں پڑا رہا، انشاءاللہ اب شائع ہو رہا ہے۔

سرورق : سلیمہ ہاشمی تزئین : اسلم کمال

ایک ایسا منصوبہ جس کی مثال سے کئی اوروں نے اپنے چراغ روشن کئے

پانچ سال کے تعطل کے باوجود یہ خاص نمبر

"تخلیق" کی اپنی روایات اور اقدار کا منفرد ثبوت ہوگا

Monthly **Takhleeq** Lahore

A Different Kind of Computer company

Engaged in Manufacturing, Sales, and Service of Computer Software and Hardware
Quality Network Products

C.WORLD

When it Comes to Workstations, And UNIX and Windows NT Servers,
We Provide all the Expertise

Please write to us for Wholesale opportunities.
150 Main St..
Monroe, CT. 06468, USA
Fax: 203-459-1184